کھڑے ہوئے ہاتھ میں ایک فرمان تھا، اور نگاہ شوق شمس العلماء کے رخِ روشن پر صدر انجمن کے اشارے سے یہ تقریر شروع کی۔

حسرت نصیب زبان اردو سے زیادہ قابلِ رحم کون ہوگا، جس کی ایک بیس پچیس ہی برس میں وہ کایا پلٹی کہ خدا دشمن کی نہ کرے۔ یہ وہی زبان ہے، جو کسی وقت شہزادیوں کا زیور، بادشاہوں کا جوہر، ایک عالم کی محبوب، ایک دنیا کی مرغوب، ہندوؤں کی جان مسلمانوں کا ایمان تھی۔ مگر تقدیر نے اس کو وہ وقت دکھایا، جب اس کے قدردان ایک ایک کرکے دنیا سے چلنے شروع ہوئے، جس کی جگہ ہر وقت بُلبلانِ خوش الحان کی چہکار اور گلہائے رنگین کی مہکار تھی۔ وہاں ایک ہوکا میدان رہ گیا۔ کبھی کوئی پھرتا پھراتا پردیسی سیلانی ادھر سے گذر جاتا، تو کسی درخت کے نیچے بیٹھ کر دو آنسو بہا لیتا۔ ورنہ اس کی اگلی بہاریں سب ختم ہوگئیں، انگریزی کے زبردست سیلاب نے اس کی ٹھنڈی اور میٹھی لہروں کا خاتمہ کردیا۔ اس نفسا نفسی کے عالم میں آزادؔ کی کوششیں شکریہ کی مستحق ہیں، جس کے دم سے چمنستانِ ادب گلزار ارم بنا رہا۔ بدقسمتی سے آزاد کو وقت ایسا ملا، جب اردو کے قدر دان باری باری عدم آباد کا رستہ لے چکے تھے۔ کوئی اتنا بھی نظر نہ آتا تھا کہ منزل مقصود کا پتہ دے۔ مگر وہ مرد میدان ہمت نہ ہارا، گو دل کے حوصلے پورے ہونے کی امیدیں خاک میں مل چکی تھیں، مگر دھن کا پکّا، ارادے کا سچا، اپنی کوششوں میں سرگرم رہا، اور اس باغ میں جو نذرخزاں ہوچکا تھا، ایسے ایسے پھول کھلا گیا، جو مدتوں آتے جاتے مسافروں کے دماغ مفرح کرتے رہیں گے۔

یہ زبان اردو کا محسن مرحوم مولوی باقر علی دہلوی کے ہاں 1246ھ ہجری میں پیدا ہوا، ہونہار بچہ کی تعلیم میں باپ نے کوئی وقیقہ فرو گذاشت نہ کیا۔ چونکہ استاد ذوقؔ سے بے تکلف دوستی تھی، شاگردی میں پیش کیا۔ ذوقؔ جیسا دکھانے والا، اور آزاد جیسا سیکھنے والا۔ آزادؔ جتنا کچھ ہوتا کم تھا۔ استاد کے فیض صحبت نے باپ کی دلی آرزو پوری کردی، اور آزادؔ ایسا شاگرد ہوا، کہ آج استاد اس پر نازاں ہے۔ آزادؔ وہ پہلا شخص ہے، جس نے گل و بلبل کی مضبوط زنجیروں کو توڑا، اور اردو شاعری کو واقعیت کے ایسے سانچے میں ڈھالا کہ آنے والی نسلیں مدۃ العمر دعائیں دیں گی۔ اس نے نثر اردو کو کمال معراج پر پہنچایا، اور ایسی یادگاریں چھوڑ گیا جو آنکھوں کو برماتی ہوئی کلیجہ پر گرتی ہیں۔

قدرت نے اس دماغ کو علم کا کچھ ایسا شوق دیا تھا کہ زندگی اسی تحقیق و تلاش میں بسر ہوگئی۔ گو عمر کا آخری حصّہ جو ان لڑکی کی موت سے ایک عجیب حالت میں بسر ہوا۔ مگر جب تک دماغ کام کرتا رہا اس وقت تک تلاش ختم نہ ہوئی۔ یہی چسکا تھا جو ہندوستان سے ایران کی سرزمین میں لے گیا۔ صحبت کا اثر تلاش کی اعانت اس شخص پر جو ایران سے ہزاروں کوس کے فاصلے پر پیدا ہوا، ایسا رنگ چڑھا کہ اہلِ زبان بھی اس کے کلام پر صاحب زبان ہونے کا شبہ کرنے لگے۔

باپ کی شہادت، استاد کی موت، 57ء کا غدر، غرض پیہم صدمات نے دلی کے رہنے میں لطف نہ رکھا۔ اس پر ابنائے وطن کی ناقدری اور سب سے زیادہ فکر معاش وہ چیز تھی، جس نے آزاد کو دلی سے جدا کیا، بال بچوں کو ساتھ لے، دلّی کو خدا حافظ کہا اور لکھنو کا رخ کیا۔ کمال کے قدر دانوں نے اشتیاق آمیز نظریں بلند کیں، مہمان نوازی کے ہاتھوں سے جہان آباد کی آخری یادگار کو سر آنکھوں پر لیا۔ مگر زمانہ کی گردش نے دلّی کے ساتھ ہی لکھنو کا بھی خاتمہ کردیا تھا۔ آزادؔ کا جی نہ لگا۔ اور 64ء میں لاہور آئے۔ ہال رائڈ صاحب کی قدر شناس آنکھوں نے علم کی کسوٹی پر اس گوہر گراں بہا کو پرکھا، اتالیق پنجاب کی سب ایڈیٹری نذر

کی۔ شاہجہانی عمارت کی خدمت آرزوئے دیرینہ تھی۔ آزادؔ نے اپنی صناعی سے وہ وہ گلکاریاں کیں کہ تمام پنجاب کلمہ پڑھنے لگا۔ استعارات و تشابیہ کی ایسی دیویاں کھڑی کردیں کہ ہندوستان بھر مسخر ہوگیا۔ اور 87ء کی جوبلی نے خطاب شمس العلماء سے آزادؔ کی قابلیت و خدمات کا اعتراف کیا۔

آبِ حیات، نیرنگِ خیال، دربار اکبری، جامع القواعد، قصص ہند کا دوسرا حصہ، اردو کی پہلی، دوسری، تیسری۔ مجموعۂ نظم اردو، دیوان ذوقؔ یہ وہ چیزیں ہیں جو اس کا نام ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔

کامل پینتالیس سال کی خدمت کے بعد اردو نے اگست 89ء میں اس نئی طرز کے موجد کو الوداع کہی۔ یہ وہ وقت تھا جب قابل بیٹی کی موت نے دماغ میں آثار جنون پیدا کردیے۔ پھر بھی ''سپاک ونماک'' ان خزانوں کا پتہ دے رہا ہے، جو اس دماغ میں پنہاں تھے، دیوانِ ذوقؔ کے خاتمہ پر نثر موزوں جو حالت جنوں کی لکھی ہوئی ہے، آج بھی دعویٰ کررہی ہے کہ کوئی صحیح دماغ والا دوسطریں اس رنگ میں لکھ دے۔

نیک استاد کے پھٹے پُرانے کاغذ کے پرزے سامنے پھیلے ہیں۔ یہ لڑکپن سے لے کر جوانی اور بڑھاپے تک کی نشانی ہیں، انہیں سامنے سے اٹھانا کیسے، بھائیوں کو الوداع کہنا ہے، یہ درست ہے کہ گراں سنگ فرض تھا، اور گراں بہا قرض تھا، جس سے آج میں ہلکا ہوا، لیکن عمروں کا ساتھ ہے اور دس مہینے دن رات آنکھوں کا تیل ٹپکایا ہے۔ موانست رو رو کر دل سے رخصت مانگتی ہے، ہائے دلگیر محنت تھی، لیکن دلپذیر محنت تھی، سخت کام تھا، مگر مزے کا کام تھا، اور ثواب پر انجام تھا۔ اب یہ کہاں، آہ استاد کہاں استاد۔''

نظم کی لڑیوں میں آزادؔ نے ایسے موتی پروئے ہیں، کہ جواب نہیں رکھتے، طرز بیان سیدھا سادہ، مگر ایسا کہ کلیجے میں گڑے۔ لطفِ زبان ایسا کہ ہر لفظ پر بے ساختہ داد نکلے، خیالات کی بلندی، مضمون آفرینی، فصاحت بلاغت کیا چیز ہے جو اس کے ہاں موجود نہیں۔

چھائی غرض خدا کی خدائی میں رات ہے — اس وقت یا تو رات ہے یا حق کی ذات ہے
خلقت خدا کی سوتی ہے غافل پڑی ہوئی — اور رات سائیں سائیں ہے کرتی کھڑی ہوئی
سوتا گدا ہے خاک پہ اور شاہ تخت پر — ماہی ہے زیر آب تو طائر درخت پر
ہے بیخبر پڑا جو بچھونوں پہ گھر میں ہے — دامانِ دشت میں کوئی سوتا سفر میں ہے
گھوڑے پہ اپنے اونگھ گیا ہے سوار بھی — چوکا ہے بلکہ راہزنِ نابکار بھی
بچہ کہ ماں کی گود میں ہے بلکہ پیٹ میں — سب آگئے ہیں نیند کی اس وقت لپیٹ میں

جس کو پکاریئے، سوئے خواب عدم گیا
دریا بھی اب تو چلنے سے شاید ہوتھم گیا

داغؔ کی تقریر کا ختم ہونا تھا، کہ وہ صورتیں آنکھ سے اوجھل ہونی شروع ہوئیں۔ شمعیں جھلملا گئیں، روشنی پھیکی پڑگئی۔ اے متبرک صورتو! کوئی دم تو اور ٹھہرو، کہ آنکھیں تمہارے دیدار سے سیر ہوجائیں، کس سے کہوں دل پر کیا گزر رہی ہے، دل رو

رہا ہے آنکھیں ڈھونڈ رہی ہیں۔ مگر اب تمہاری صورتیں ایک دھندلی سی تصویر دکھائی دے رہی ہیں، آہ وہ بھی نہ رہیں۔

مذاق صحیح اور عقل سلیم دونوں شاہد ہیں۔ نقّادانِ سخن کی نگاہیں دیکھ رہی ہیں کہ بدنصیب اردو کے سر سے اس شخص کا سایہ اٹھا، جو عمر عزیز کا بڑا اور زندگی جیسی نعمت کی کل کائنات لطیف زبان کی نذر کرگیا۔ فراق آزادؔ امید یقینی اور فیصلہ قطعی تھا۔ مگر یہ ہے وہ موت جس پر سینکڑوں زندگیاں نثار۔

زمانہ بدل جائے، مذاق بگڑ جائیں، آسمان زمین سب نئے ہوجائیں، مگر مرحوم آزادؔ میدانِ سخن میں ایسے موتی لٹا گیا، جو ہمیشہ جگمگائیں گے۔ یہ بے موسم کی ترکاری اور بے فصل کا میوہ ہمیشہ سدا بہار پھولوں کا مزہ دے گا۔

الفاظ و معانی

آنکھ جھپکنا آنکھیں کھلنا اور بند ہونا، روشنی کی تاب نہ لانا **فرو گذاشت** بھول، خطا، کوتاہی، غفلت **اکتساب** کمانا، ذاتی محنت سے حاصل کرنا **خوش الحان** اچھی آواز والا **سنگلاخ** پتھریلی زمین یا پہاڑی علاقہ **فصاحت** خوش کلامی، خوش بیانی **بلاغت** کلام میں انتہائی درجے تک پہنچنا، فصیح کلام **اقلیم** ممالک، سلطنت، **مفرح** فرحت دینے والا، خوش کرنے والا **غلغلہ** ہنگامہ، شور و غل، دھوم **ہفت پارچہ** دقیقہ، کوئی چھوٹی چیز، معمولی بات، باریکی **خلعت** وہ پوشاک جو بادشاہ یا امراء کی طرف سے بطورِ عزت افزائی ملے **اعانت** مدد، سہارا **مُسخّر** تسخیر کیا گیا، تابع کیا گیا **موٗجد** ایجاد کرنے والا، نئی بات نکالنے والا، بانی **مُوانَست** باہمی، انس، محبت **نقاد** پرکھنے والا، تنقید اور تبصرہ کرنے والا، اچھائی بُرائی ظاہر کرنے والا

مشق

.1 مندرجہ ذیل سوالوں کے جواب ایک جملے میں لکھیے :

(1) کس محفل کو ''بہار کی محفل'' کہا ہے؟

(2) کس شوق کی وجہ سے آزادؔ کی زندگی تحقیق و تلاش میں بسر ہوئی؟

(3) محمد حسین آزادؔ کا انتقال کب ہوا؟

(4) کس صدمہ نے آزادؔ کے دماغ میں آثارِ جنون پیدا کردیا؟

(5) مصنف نے دیوانِ ذوق کی تعریف میں کیا کہا؟

.2 مندرجہ ذیل سوالوں کے جواب دو۔ تین جملوں میں لکھیے :

(1) تعلیم سخن کے بادشاہ کسے کہا ہے؟ مصنف نے ان کی تعریف کس طرح کی ہے؟

(2) مصنف نے زبانِ اردو کی تعریف میں کیا کہا ہے؟

(3) آزادؔ جیسے شاگرد پر استاد کو کیوں ناز تھا؟

(4) کن وجوہات کی بنا پر آزادؔ کو دلّی چھوڑنا پڑی؟

(5) محمد حسین آزادؔ کی کون سی تصانیف سے ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا؟

(6) لاہور میں رہ کر مرحوم آزاد اپنی کون سی قابلیت اور خدمات سے متعارف ہوئے؟

3. **مندرجہ ذیل سوالوں کے جواب تفصیل سے لکھیے :**

(1) بزم اردو کے معزز مہمانو! مخاطب ہوکر مصنف نے کس بات کا اظہار افسوس کیا ہے؟

(2) چمنستانِ ادب کو گلزار بنانے والے آزادؔ کی تعریف مصنف نے کس طرح کی ہے؟

(3) ''بزم شعراء اور محمد حسین آزادؔ کا جلسۂ اعزاز'' کی منظر کشی اپنے الفاظ میں لکھیے۔

4. **(الف) واحد کی جمع، جمع کا واحد لکھیے :**

اغیار قلم اجسام نقادان شعراء علم استاد

(ب) مندرجہ ذیل الفاظ سمجھائیے :

غیر مترقبہ دنیائے اجسام نگاہِ شوق گلہائے رنگین دقیقہ فروگذاشت مدۃالعمر

(ج) محاوروں کو جملوں میں استعمال کیجیے

ڈنکا بجنا چار چاند لگنا، خون کے آنسو رونا، پیوند زمین ہونا،

(د) کہاوت کو تین چار سطروں میں سمجھائیں :

''گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے''

•

20 غزل

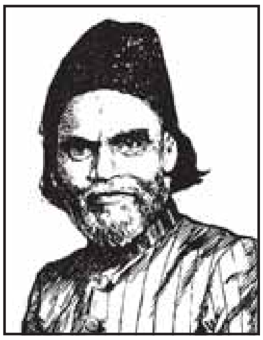

جگرؔ مرادآبادی

پیدائش : 1890ء وفات : 1960ء وطن : مُرادآباد

نام سکندر علی اور جگرؔ تخلص کرتے تھے۔ بزرگوں کا وطن دہلی تھا۔ آپ کے مورثِ اعلیٰ مولوی محمد سمیع شاہ جہاں کے استاد تھے۔ لیکن عتاب شاہی کے وجہ سے دلّی چھوڑ کر مُرادآباد آنا پڑا۔ اس خاندان میں علم کا چرچا تھا۔ جگرؔ کے والد مولوی نظر علی بھی شاعر اور صاحبِ دیوان تھے۔ جگر کی ابتدائی تعلیم و تربیت زیادہ نہیں ہے۔ عربی سے بالکل ناواقف تھے۔ فارسی میں یوسف و زلیخا اور سکندر نامہ تک پڑھی تھی۔ انگریزی بھی بہت کم جانتے تھے۔

جگرؔ نہایت شگفتہ مزاج و رنگین طبع آدمی تھے ایک حسنِ مجاز کی تلاش میں مختلف مضافات کی سیر کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ حسن کی ایک ایک داستان سے واقف تھے۔ 14 برس کی سن سے شعر کہنا شروع کردیا۔ ابتدا میں اصلاح اپنے والد سے لیتے تھے۔ ان کے بعد داغؔ کو کلام دِکھانے لگے اور داغؔ کے بعد منشی امیراللہ تسلیم کو کئی غزلیں دکھلائیں۔

جگرؔ کی شاعری میں کیف، وارفتگی اور بے خودی کی لہر قریب قریب ہر جگہ موجود ہے۔ جو کلام میں ایک امتیازی شان اور شاعر کے انہماکِ ذوق و جوشِ فکر کا پتہ دیتی ہے۔ ان کا دل لذت عشق کا سرمایہ دار ہے۔ جس کے اثر سے کلام میں رنگینی اور دل کشی کا ایسا اضافہ ہوجاتا ہے جس سے پڑھنے والے پر ایک خاص محویت طاری ہوجاتی ہے۔

غیرت بندگی و ناچاری
کوئی بندہ نواز کیا جانے

آئینے کی نزاکتیں ہے ہے
دست آئینہ ساز کیا جانے

آنکھ جو دیکھتی ہے، دیکھتی ہے
دل کے راز و نیاز کیا جانے

سینۂ نے پہ جو گزرتی ہے
وہ لب نے نواز کیا جانے

کثرت جلوہ و ہجوم نظر
عشق وحدت طراز کیا جانے

حُسن کی دل گدازیاں ہے ہے
عشق بہ سوز و ساز کیا جانے

وہ حقیقت کہ جو گزرتی ہے
لب افسانہ ساز کیا جانے

ہائے گل کاریاں محبت کی
دامن پاکباز کیا جانے

رہروِ راہ بیخودی ہے جگرؔ
وہ نشیب و فراز کیا جانے

الفاظ و معانی

آئینہ ساز شیشے بنانے والا **نے** بانسری **نے نواز** بانسری بجانے والا **گل کاریاں** نقّاشی، بیل بوٹے کا کام

مشق

.1 سوالوں کے جواب لکھیے :

(1) بندہ نواز کن باتوں سے ناواقف ہیں؟

(2) تیسرے شعر کے حوالے سے بتایئے کہ شاعر کیا کہنا چاہتا ہے؟

(3) ''سینۂ نے'' سے کیا مراد ہے؟

(4) دامنِ پاکباز کیا نہیں جانتے؟

.2 اشعار سمجھایئے :

(1) سینۂ نے پہ جو گزرتی ہے
وہ لب نے نواز کیا جانے

(2) وہ حقیقت کہ جو گزرتی ہے
لب افسانہ ساز کیا جانے

●

21 ہزاروں سال لمبی رات

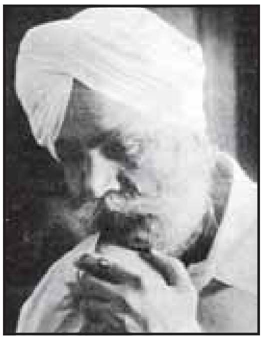

رتن سنگھ

پیدائش : 1927ء

رتن سنگھ سیالکوٹ میں دریائے راوی کے کنارے بسے ہوئے ایک گاؤں داؤد میں پیدا ہوئے۔ وہیں ان کی پرورش ہوئی۔ ان کا بچپن کافی مشکلات میں گزرا۔ رتن سنگھ نے ہائی اسکول پاس کرکے پندرہ سال بعد بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔

رتن سنگھ اپنے خاندان کے پس منظر کے بارے میں لکھتے ہیں؟ لکھنے پڑھنے سے کسی کا تعلق نہیں تھا۔ چھوٹی دادی کو پنجاب کے قصے اور شاعری پڑھنے کا شوق تھا۔ جب ان کی آنکھیں کمزور ہوئیں تو مجھ سے قصے پڑھوا کرسنتی تھیں۔ اس لیے آٹھ سال کی عمر میں اچھا ادب پڑھنے کا شوق ہوگیا۔

تقسیم ملک کے دوران میں جب ان کے وطن کے سیاسی حالات بگڑے تو ہجرت کرکے دہلی چلے آئے۔ بعد ازاں لکھنؤ میں قیام کیا اور ریلوے میں ملازم ہوگئے۔ 16 سال تک ریلوے میں ملازمت کرنے کے بعد آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہوگئے۔

رتن سنگھ نے پنجابی زبان میں شاعری کرکے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔لکھنؤ کے ادبی ماحول نے کہانیاں کہنے پر اکسایا اور وہ اردو میں کہانیاں لکھنے لگے۔ ان کی پہلی کہانی ''ممی تم ایک دیوار ہو'' رسالہ 'راہی' میں شائع ہوئی۔

کمسنی میں وطن چھوڑنے کے سانحہ اور ماضی کی دلخراش یادوں کی جھلک ان کی اکثر کہانیوں میں ملتی ہیں۔مختصر سے مختصر الفاظ میں بڑی سے بڑی بات کہنا رتن سنگھ کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان کے افسانوں میں جاذبیت اور دلکشی ہے۔ ان کے انداز بیان میں توانائی اور تیکھا پن ہے۔ وہ براہِ راست بات کہنے کے عادی ہیں جس میں کوئی پیچیدگی نہیں ہوتی۔

''ہزاروں سال لمبی رات'' رتن سنگھ کی ایک علامتی کہانی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا کے تمام کاروبار چاہے وہ فن ہو، ادب ہو یا جو کچھ ہو انسان کی دوڑ دھوپ صرف پیٹ بھرنے کی حد تک ہی ہے۔

سننے والے اس کی بات بڑے انہماک سے سن رہے تھے حالانکہ کہ سنانے والا جوان سب کے بیچ لیٹا ہوا تھا، بالکل اوٹ پٹانگ باتیں کررہا تھا۔ ان میں کہیں کوئی تسلسل نہیں تھا۔ بات کرتا کرتا وہ خود ہی بہک جاتا جیسے راہ چلتا مسافر اپنی راہ سے بھٹک کر کسی غلط راستے پر چلنے لگے۔ ایک بات ادھوری ہی چھوڑ کر وہ کسی دوسری بات کا سرا پکڑلیتا۔ اس طرح رات دھیرے دھیرے سرک رہی تھی۔

وہ سب کے سب ریلوے اسٹیشن کی طرف جانے والی بازار کی ایک دوکان کے برآمدے میں آکر رات کاٹنے کے لیے لیٹ گئے تھے۔تھوڑی دیر بعد جب ان میں سے سب سے بوڑھے آدمی نے گلا صاف کرتے ہوئے کسی راجہ کی بات شروع کی تو اس برآمدے میں لیٹے ہوئے سب کے سب آدمی ہنکاری بھرنے لگے۔''ہوں، پھر کیا ہوا بابا۔''

ایک بادشاہ تھا اس کی سات رانیاں تھیں۔

ساتوں رانیوں کے لیے بادشاہ نے الگ الگ محل بنوائے۔ ایک لکڑی کا، دوسرا اینٹ گارے کا، تیسرا سنگِ مرمر کا، چوتھا تانبے کا، پانچواں چاندی کا، چھٹا سونے کا اور ساتویں میں ہیرے جواہرات جڑے تھے۔

''بالکل ٹھیک۔'' کسی نے ہنکاری بھری۔

اتنی دولت ہونے پر بھی بادشاہ کے یہاں اولاد نہیں تھی۔ اس لیے وہ بہت دکھی تھا۔ بادشاہ کو کسی نے آخر رائے دی کہ فلاں جنگل میں ایک پیڑ ہے اس پر سات پھل لگے ہیں۔ اگر بادشاہ پھلوں کو توڑ کر اپنی رانیوں کو کھلائے تو سب کے اولاد ہوجائے گی۔لیکن مصیبت یہ تھی کہ اس پیڑ تک پہنچنا بڑا مشکل تھا۔ راستے میں سات دریا پڑتے تھے اور سات دیوؤں سے مقابلہ کرنا پڑتا تھا اور پیڑ کے گرد سات سانپوں کا زبردست پہرہ تھا۔لیکن بادشاہ بھی اپنی دھن کا پکّا تھا وہ اپنا لاؤ لشکر لے کر چل پڑا۔ بات ابھی یہیں تک پہنچی تھی کہ بوڑھے کو کھانسی کا دورہ پڑا۔ جب اس کی سانس درست ہوئی تو بوڑھا بہک گیا۔ اس نے ایک دوسری بات چلا دی۔

بڑی پرانی بات یہ ہے۔ ایک کاریگر نے ایک ایسا ڈنڈا بنایا جس کے اندر ایک آدمی بیٹھ سکتا تھا۔ اس طرح وہ ڈنڈا آدمیوں کی طرح ہی بولتا تھا، چلتا تھا اور کھاتا پیتا تھا۔

''ٹھیک۔ٹھیک۔'' قریب قریب سب نے مل کر ہنکار ابھرا۔

پھر اچانک یہ ہوا کہ رکشوں اور تانگوں کا ریلہ شور مچاتا ہوا سڑک پر سے گزرنے لگا۔ شاید اسٹیشن پر کوئی مسافر گاڑی رُکی تھی۔ اس لیے بوڑھا تھوڑی دیر رُکا۔ پھر اس نے ایک مچھلی کی بات شروع کر دی جو اتنی بڑی تھی کہ اس کی پیٹھ پر باقاعدہ ایک شہر بسا ہوا تھا۔جس پر نہ معلوم کتنے ہی مکان بنے ہوئے تھے کتنے ہی کھیت تھے۔سمندر میں جس طرف یہ مچھلی جاتی اس طرف یہ بسا بسایا شہر چلا جاتا۔

''بالکل ٹھیک۔'' سب نے ہنکاری بھری۔

اس طرح رات نہایت آہستہ آہستہ کھسک رہی تھی بوڑھا باتیں کیے جا رہا تھا اور وہ سب کے سب بڑے غور سے سن رہے تھے۔ پھرکسی بات کو ادھوری ہی چھوڑ کر بوڑھے نے ایک نئی بات شروع کی۔

ہزاروں سال پہلے کی بات ہے ایک بادشاہ نے آدھی دنیا فتح کرلی۔

''پھر''

پھر اس خوشی میں بادشاہ نے ایک بہت بڑی دعوت دی۔

''پھر۔'' ''پھر۔''

پھر کیا اتنا کھانا بنایا گیا کہ بادشاہ کے شہر کے سارے کے سارے مکانوں میں کھانا بنا بنا کر رکھا گیا۔

''پھر۔ پھر۔ پھر'' سبھی آدمی ایک ساتھ ہنکاری بھر رہے تھے۔

بوڑھے نے کہنا شروع کیا۔

''سب سے پہلے بادشاہ اور اس کے رشتہ داروں نے کھانا کھایا۔

''ٹھیک۔''

پھر بادشاہ کے سینکڑوں امیروں وزیروں نے کھانا کھایا۔

''ٹھیک۔''

پھر بادشاہ کے ہزاروں فوجیوں اور چنے ہوئے شہریوں نے کھانا کھایا۔

''ٹھیک۔''

اتنے لوگوں کے کھانا کھاتے کھاتے رات ہوگئی۔

''ٹھیک۔''

اور سب کے بعد رات کے وقت لاکھوں غریب غرباء اور فقیروں نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔

''بالکل جھوٹ۔ بالکل جھوٹ۔'' اس برآمدے میں لیٹے ہوئے سبھی آدمی احتجاجاً اٹھ کھڑے ہوئے اور ان میں ایک آدمی بولا ''بوڑھے تجھے جھوٹی باتیں کرتے شرم نہیں آتی۔ اگر ہم نے رات کو پیٹ بھر کھانا کھایا ہوتا تو اس وقت چین کی نیند نہ سوئے ہوتے۔ رات بھر تمہاری یہ بکواس کون سنتا۔''

''ارے بھائی ناراض کیوں ہوتے ہو۔'' بوڑھے نے کچھ سہمی ہوئی آواز میں کہا ''میں بھی تمہاری طرح بھوکا ہوں۔ اگر مجھے ہی نیند آرہی ہوتی تو یہ باتیں کرنے کے لیے جاگتا ہوتا۔ میں بھی ......تو سوجاتا۔''

الفاظ و معانی

انہماک سے غور سے **احتجاجاً** اعتراض کے طور پر **ہنکاری بھرنا** ہاں میں ہاں ملانا **دُھن کا پکّا** وہ شخص جو کسی خیال یا بات کے پیچھے لگ جائے **اوُٹ پٹانگ** بے معنی، بے جوڑ

مشق

1. (الف) سوالوں کے جواب لکھیے :

(1) کہانی سنانے والا کس انداز سے کہانی سنا رہا تھا؟

(2) لوگ کب تک دلچسپی سے کہانی سنتے رہے؟ کیوں؟

(3) کہانی سنتے سنتے لوگ ناراض کیوں ہوگئے؟

(4) کہانی سنانے والے نے اپنا بچاؤ کس طرح کیا؟

(5) بادشاہ نے ساتوں رانیوں کے لیے کس طرح کے محل بنوائے تھے؟

2. (واوین) ''......'' جب کوئی اقتباس دیا جاتا ہے یا کسی کی بغیر تبدیلی لکھی جاتی ہے تو اس کے شروع اور آخر میں ''......'' یہ علامت لگائی جاتی ہے۔

3. اس علامت والے جملے اس سبق میں بیان ہوئے ہیں انہیں تلاش کر کے لکھیے۔

4. غیر مفرد جملے دو قسم کے ہوتے ہیں۔

(1) مرکب جملہ اور (2) پیچیدہ جملہ

جب دو یا دو سے زیادہ جملے اس طرح مل کر آئیں کہ دونوں کی حیثیت برابر کی ہو اسے مرکب جملہ کہتے ہیں۔ مثلاً وہ شہر پہنچا اور دوست سے ملا۔

اگر کسی غیر مفرد جملے میں دو یا دو سے زائد فقروں میں سے ایک معنوی سطح پر آزاد ہو اور بقیہ فقرے اس کے تابع ہوں تو ایسے جملے کو پیچیدہ جملہ کہا جاتا ہے۔ مثلاً جب گھر لوٹا تو میں سو رہا تھا۔

مرکب اور پیچیدہ جملے اس سبق سے تلاش کر کے لکھیے۔

•

غزل	22

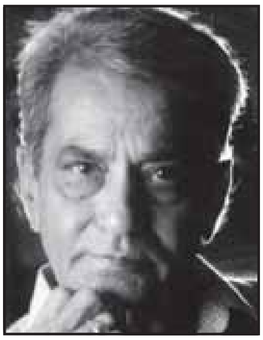

محمد علوی

پیدائش : 1927ء وطن : احمد آباد گجرات

محمد علوی نے علم پرور اور ادبی گھرانے میں آنکھ کھولی۔ ان کے بزرگ عربی اور فارسی کے عالم تھے۔ محمد علوی دورِ جدید کے جواں فکر اور خوش گو شاعر ہیں۔ غزل اور نظم دونوں یکساں مہارت کے ساتھ کہتے ہیں۔

محمد علوی نے زبان و بیان دونوں سطحوں پر نئے نئے تجربات کیے ہیں۔ ان کا ذہن آزادی کا متمنی ہے۔ لہٰذا وہ ہر طرح کی روایت سے انحراف کرتے ہیں۔ ان سے اردو کی نئی غزل نئے رنگ اور نئے ذائقے سے آشنا ہوئی ہے۔

انسانی مزاج کے جتنے پہلوؤں کا اظہار محمد علوی کے شعروں میں ہوا ہے اس کی مثال شاید ہی دوسرے شاعروں کے یہاں ملے۔

خالی مکان، آخری دن کی تلاش، تیسری کتاب اور چوتھا آسمان ان کے شعری مجموعے ہیں۔ ان کا کلیات بھی شائع ہو چکا ہے۔

محمد علوی کو ان کے آخری مجموعۂ کلام ''چوتھا آسمان'' پر ساہتیہ اکادمی دہلی کا ایوارڈ مل چکا ہے۔ اردو ساہتیہ اکادمی (گجرات) نے بھی انہیں اعزاز عطا کیا ہے۔

جزیروں کو پتہ ہے کیا ہے پانی
کھلی ہے آنکھ تو دیکھا ہے پانی

بڑی اونچائیوں سے وادیوں میں
چھلانگیں مارتا اترا ہے پانی

ندی نالوں کو دریاؤں کو لے کر
سمندر ڈھونڈنے نکلا ہے پانی

یونہی اُڑتے نہیں آبی پرندے
کہیں نزدیک ہی بہتا ہے پانی

درختوں سے یہ کیسی دوستی ہے
انھیں چھپ چھپ کے کیوں ملتا ہے پانی

پڑا رہتا ہے گہری کھائیوں میں
بہت چل چل کے جب تھکتا ہے پانی

کبھی تنہائی میں دریا کنارے
سُنا ہے تم نے کیا کہتا ہے پانی

چمکتا ہے پہاڑوں کے سروں پر
کنوؤں میں اونگھتا رہتا ہے پانی

الفاظ و معانی

جزیرہ ٹاپو، خشکی کا وہ قطعہ جس کے چاروں طرف پانی ہو

مشق

2. سوالوں کے جواب لکھیے :

(1) ''کھلی ہے آنکھ'' تو دیکھا ہے پانی سے کیا مراد ہے؟

(2) وادیوں میں پانی کس طرح اترتا ہے؟

(3) سمندر پانی ڈھونڈنے کے لیے کسے ساتھ لے کر نکلا ہے؟

(4) محمد علوی نے پانی کے کن مختلف روپ کا ذکر کیا ہے؟

(5) پانی اور آبی پرندوں کا کیا رشتہ ہے؟ واضح کیجیے۔

(6) درختوں اور پانی کی دوستی اپنے الفاظ میں بیان کریں۔

2. تشریح کیجیے :

جزیروں کو پتہ ہے کیا ہے پانی
کھلی ہے آنکھ تو دیکھا ہے پانی

درختوں سے یہ کیسی دوستی ہے
انھیں چھپ چھپ کے کیوں ملتا ہے پانی

●

23

آوارہ گرد

قرۃ العین حیدر

پیدائش : 1927ء، وفات : 2007ء

آبائی وطن نہٹور ضلع بجنور ہے لیکن پیدائش علی گڑھ میں ہوئی۔ قرۃ العین حیدر نے ادبی ماحول میں آنکھیں کھولیں۔ ان کے والد سجاد حیدر یلدرم اردو کے صاحب طرز انشا پرداز تھے۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم۔ اے کیا۔ اور وزٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو اور جامعہ ملیہ کی شعبۂ اردو سے وابستہ رہیں۔ اردو انگریزی دونوں زبانوں پر قدرت رکھتی ہیں۔ یورپ کا سفر بھی کیا اور یورپی ادب کا بغور مطالعہ کیا۔

وہ ایک بلند پایہ ناول نگار اور افسانہ نویس ہیں۔ ان کے افسانے عموماً جدید طرز معاشرت سے متعلق ہوتے ہیں۔ انسانی فطرت کی کمزوریوں اور خامیوں پر بڑی گہری نظر رکھتی ہیں۔ ان کے افسانے جدید ہونے کے باوجود بے حد پرکشش ہوتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر نے بڑوں کے ادب کے ساتھ ساتھ ادب اطفال کی طرف بھی توجہ کی ہے۔ بچوں کے لیے جو کتابیں دوسری زبانوں سے اردو میں ترجمہ کی ہیں ان میں 'شیر خان' اور ''بھیڑیے کے بچے'' بڑی دلچسپ کتابیں ہیں۔ ستاروں سے آگے، شیشے کا گھر اور پت جھڑ کی آواز، ان کے افسانوں کے مجموعے ہیں۔

پچھلے سال، ایک روز شام کے وقت دروازے کی گھنٹی بجی۔ میں باہر گئی۔ ایک لمبا تڑنگا یورپین لڑکا کینوس کا تھیلہ کندھے پر اٹھائے سامنے کھڑا تھا۔ دوسرا بنڈل اس نے ہاتھ میں سنبھال رکھا تھا اور پیروں میں خاک آلود پشاوری چپل تھے۔ مجھے دیکھ کر اس نے اپنی دونوں ایڑیاں ذرا سی جوڑ کر خم کیا۔ میرا نام پوچھا اور ایک لفافہ تھما دیا۔ ''آپ کے ماموں نے یہ خط دیا ہے۔'' اس نے کہا۔

''اندر آجاؤ۔'' میں نے اس سے کہا اور ذرا اچنبھے سے خط پر نظر ڈالی۔ یہ الّن ماموں کا خط تھا اور انھوں نے لکھا تھا ......

''ہم لوگ کراچی سے حیدرآباد سندھ واپس جارہے تھے۔ ٹھٹھ کی ماکلی ہل پر قبروں کے درمیان اس لڑکے کو بیٹھا دیکھا۔ اس نے انگوٹھا اٹھا کر لفٹ کی فرمائش کی اور ہم اسے گھر لے آئے۔ یہ دنیا کے سفر پر نکلا ہے اور اب ہندوستان جارہا ہے۔ اوٹو بہت پیارا لڑکا ہے میں نے اسے ہندوستان میں عزیزوں کے نام خط دے دیئے ہیں اور ان کے پاس ٹھہرے گا۔ تم بھی اس کی میز بانی کرو۔

نوٹ : اس کے پاس پیسے تقریباً بالکل نہیں ہیں۔''

لڑکے نے کمرے میں آکر تھیلے فرش پر رکھ دیئے اور اب آنکھیں چندھیا کر دیواروں پر لگی ہوئی تصویریں دیکھ رہا تھا۔ اتنے اونچے قد کے ساتھ اس کا بچوں کا سا چہرہ تھا، جس پر ہلکی ہلکی سنہری داڑھی مونچھ بہت عجیب سی لگ رہی تھی۔

ایک اور ہچ ہائیکر...... میں نے ذرا کوفت سے سوچا۔ الّن ماموں بے چارے فرشتہ صفت آدمی اس کی چکنی چپڑی باتوں میں آگئے ہوں گے کیوں کہ یہ بین الاقوامی آوارہ گرد اپنی مطلب برآری کے لیے راہ چلتوں سے دوستی کر لینے کا

فن خوب جانتے ہیں۔

''شاہدہ نے بھی آپ کو سلام کہا ہے۔'' اس نے میری طرف مڑ کر بڑی اپنائیت سے کہا۔

''شاہدہ۔''

''آپ کی کزن شاہدہ۔ میں بنارس میں ان کے یہاں مقیم تھا اور لکھنؤ میں آپ کی پھوپھی کے یہاں۔ اور چاٹگام میں انکل انور کے یہاں رہوں گا اور اگر دار جلنگ جاسکا تو کزن مطہرہ کے گھر پر ٹھہروں گا۔'' اس نے جیب میں سے مزید لفافے نکالے۔

''بیٹھ جاؤ ...... اوٹو ...... چائے پیو ......'' میں نے ایک لمبا سانس لے کر کہا۔ مجھے وہ دو ڈچ ہچ ہائیکر یاد آئے، جنھوں نے کراچی میں لڈّن ماموں کے گھر پر ڈیرے ڈال دیئے تھے، کیونکہ ان کے پاس پیسے ختم ہوگئے تھے۔

''میں ترکی اور ایران ہوتا ہوا آیا ہوں اور جرمنی سے یہاں تک میں نے موٹروں اور لاریوں میں لفٹ لیے ہیں۔ اب لنکا جاؤں گا۔ پھر تھائی لینڈ وغیرہ۔ وہاں سے کارگوبوٹ کے ذریعے جاپان، امریکہ اور اس کے بعد گھر واپس۔ اس وقت تو میں اورنگ آباد سے ایک ٹرک پر آرہا ہوں۔''

''بے حد ایڈونچر رہے ہوں گے تمہارے سفر میں۔''

''ہاں۔ استنبول میں، میں تین راتیں غلطہ کے پل کے نیچے سویا اور ایران میں......'' پھر اس نے مختلف چھوٹے چھوٹے ایڈونچر سنائے۔ ''میں کولون یونیورسٹی میں پڑھتا ہوں۔'' اس نے مزید اطلاع دی۔

''پاکستان اور ہندوستان میں تم نے کیا فرق پایا؟'' کھانے کی میز پر میں نے اس سے پوچھا۔

''وہاں سب لوگ مجھ سے مسئلہ کشمیر پر بڑے جوش و خروش سے باتیں کرتے تھے۔ یہاں کشمیر اور پاکستان کا ذکر بہت کم کیا جاتا ہے۔ یہاں کے مسائل......'' پھر اس نے ہندوستان کے مسائل پر ایک جامع تقریر کی۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا، ''میں دولت مند سیّاحوں اور عام یورپینوں اور امریکنوں کی مانند محض تاج محل دیکھنے نہیں آیا ہوں۔ میں رات بھر دوکانوں کے برآمدوں میں سوتا ہوں۔ کسانوں کی جھونپڑیوں میں رہتا ہوں۔ مزدوری سے دوستی کرتا ہوں۔ حالانکہ ان کی زبان نہیں سمجھ سکتا۔''

کھانے کے بعد اس نے بمبئی کا نقشہ نکال کر فرش پر پھیلا دیا۔ بچارے انگریز بمبئی کے طرز تعمیر کو وِکٹورین گوتھک کہتے تھے۔ یہاں کیا کیا چیز قابلِ دید ہیں؟''

''ایلفنٹا اور اپالو بندر۔ اور......''

''یہ سب گائیڈ بک میں بھی موجود ہے۔'' اس نے ذرا بے صبری سے میری بات کاٹی۔ اور ہندوستان کی معاشیات اور عمرانیات ثقیل اور مدلل گفتگو سے مجھے نوازا۔

''اوٹو...... تمہاری عمر کتنی ہے۔'' میں نے مسکرا کر پوچھا۔

''میں اکیس سال کا ہوں۔'' اس نے بڑے وقار سے جواب دیا ''اور جب جرمنی واپس پہنچوں گا تو بائیس سال کا ہوجاؤں گا۔ اور اس کے اگلے سال مجھے ڈاکٹریٹ مل جائے گا۔ میں یونیورسٹی میں جرمن غنائیہ شاعری کا مطالعہ کررہا ہوں۔ جرمنی میں صرف

ڈاکٹریت ملتی ہے۔ جس طرح آپ کے بی اے۔ ایم اے۔'' بعد ازاں وہ دیر تک جرمن غنائیہ شاعری، عالم گیر سیاست اور ہندوستانی آرٹ پر روشنی ڈالتا رہا۔ وہ تصویریں بھی بناتا تھا۔ کس قدر بقراط لڑکا ہے۔ میں نے دل میں سوچا۔ بیشتر جرمنوں کی طرح انتہائی سنجیدہ، دھن کا پکا اور حس مزاح سے تقریباً عاری۔

''میں رات کو سونے سے پہلے آپ کی کتابیں دیکھ سکتا ہوں؟''

''یقینا۔''

''رات گئے تک نشست کے کمرے میں روشنی جلتی رہی۔ صبح تین بجے غسل خانے میں پانی گرنے کی آواز آئی، تو میری آنکھ کھل گئی۔ وہ رات نہا دھو کر فارغ ہوچکا تھا تاکہ صبح کو اس کی وجہ سے گھر والوں کو زحمت نہ ہو۔ ناشتے کے وقت اس نے ہندوستان کے متعلق اس کتاب پر تبادلۂ خیالات کیا جو اس نے رات بھر میں پڑھ کر ختم کر ڈالی تھی۔ پھر اس نے بمبئی کا نقشہ اٹھایا اور سیاحی کے لیے نکل گیا۔

وہ اپنے تھیلے میں پانچ کتابیں لے کر چلا تھا۔ جن پر کمرہ ٹھیک کرتے وقت میری نظر پڑی۔ گوئٹے کی فادسٹ، ہائینے کی نظمیں، رلکے، بریخٹ اور انجیل مقدس۔ شاک کو جب وہ تھکا ہارا مگر بے حد بشاش واپس آیا تو میں نے اس سے کہا۔''اوٹو! ...... کل رات تم خدا سے منکر تھے۔، مگر انجیل ساتھ لے کر گھومتے ہو!'' اس پر اوٹو نے خدا کے تصور میں ایک جذباتی سہارے کی انسانی حاجت پر مختصر تقریر کی۔

''اوٹو تم ایلیفنٹا گئے تھے؟ وہاں کی تری مورتی اور دیوتا ......''

''میں کہیں بھی نہیں گیا۔ وکٹوریہ گارڈن میں دن بھر بیٹھا عوام کے ہجوم کا مطالعہ کرتا رہا، انسان انسان سب سے بڑا دیوتا ہے۔''

''ہاں ہاں ...... یہ تو بالکل ٹھیک ہے۔ مگر تم نے کھانا کہاں کھایا؟''

''میں نے ایک درجن کیلے خرید لیے تھے''۔

مجھے دفعتاً سخت ندامت ہوئی، کہ چلتے وقت سنڈوچز اس کے ساتھ کرنے مجھے کیوں نہ یاد رہے اور مجھے الّن ماموں کے خط کا خیال آیا جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ اس کے پاس پیسے تقریباً بالکل نہیں ہیں۔

کھانے کی میز پر اس نے کہا۔''میں بہت دنوں بعد پیٹ بھر کھانا کھا رہا ہوں۔''

میں اس سے جرمنی کے متعلق باتیں کرتی رہی۔ برلن کی دیوار کا ذکر کرتے ہوئے اس نے مجھے اطلاع دی کہ وہ بہت سخت اینٹی کمیونسٹ ہے۔

''گھر پر میری اماں بھی میرے لیے بہت مزیدار کھانے پکاتی ہیں۔ آپ میری اماں سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔ اب ان کی عمر بیالیس سال کی ہے۔ مصائب نے ان کو قبل از وقت بوڑھا کردیا ہے، مگر وہ اب بھی دنیا کی حسین ترین عورت ہیں۔''

''تم ان کے اکلوتے لڑکے ہو؟''

''ہاں، میرے ابّا فوجی افسر تھے۔ امّاں پرشا کی رہنے والی ہیں۔ امّاں سترہ سال کی تھیں، جب انھوں نے ابّا سے شادی

کی۔ ابّا پولینڈ کے محاذ پر مارے گئے۔ ان کے مرنے کے دوسرے مہینے میں پیدا ہوا۔ بمباری سے بچنے کے لیے مجھے کندھے سے لگائے لگائے ماں جانے کہاں کہاں گھومتی رہیں۔ وہ مجھے گود میں اٹھائے، سر پر رومال باندھے فل بوٹ پہنے اپنا مختصر سا سامان میری پریمبولیٹر میں ٹھونسے گاؤں گاؤں پھرتی تھیں اور کھیتوں کھلیانوں میں چھپتی رہتی تھیں۔ امّاں پولینڈ میں ایک گاؤں میں چھپی ہوئی تھیں جب پولس فوجی اس رات اس مکان میں گھس آئے۔ میں اس وقت پورے چار سال کا تھا۔ میرے بچپن کی واضح ترین یاد اس قہر ناک رات کی ہے ...... میں ڈر کر پلنگ کے نیچے گھس گیا۔ جب افسروں نے میری امّاں کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا تو میں زور زور سے رونے لگا۔ وہ امّاں کو گھسیٹ کر باہر کھیتوں میں لے گئے۔ امّاں کئی دن بعد واپس آئیں۔ وہ فوجیوں سے بچنے کے لیے اتنے عرصے تک ایک کھلیان میں چھپی رہی تھیں اور میں اس خالی مکان میں اکیلا تھا اور باہر گولیاں چلنے کی آواز پر سہم سہم کر کرنوں کھدروں میں چھپتا پھرتا تھا اور نعمت خانے اور باورچی خانے کی الماریاں کھول کھول کر کھانے کی چیزیں تلاش کرتا تھا اور جو کچھ پڑا مل جاتا تھا بھوک کے مارے منہ میں رکھ لیتا تھا۔ مگر وہ الماریاں سب اونچی اونچی تھیں جن میں کھانے پینے کا سامان رکھا تھا۔'' وہ چپ ہوگیا اور خاموشی سے کھانا کھانے میں مصروف ہوگیا۔ ''یہ چاول بہت مزے کے ہیں۔'' اس نے چند منٹ بعد آہستہ سے کہا۔

اسی وجہ سے میں جنگ کا تکلیف دہ ذکر اس سے نہ چھیڑنا چاہتی تھی۔ میں جنگ کے بعد بڑی ہونے والی نسل سے اس طرح کے لرزہ خیز واقعات سن چکی تھی۔ مجھے وہ فرانسیسی لڑکی یاد آئی جس نے زوال فرانس کے بعد اسی اوٹو کے ہم قوم جرمنوں کی درندگی کے قصے سنائے تھے۔ اسی پولینڈ میں جہاں اوٹو اور اس کی ماں پر یہ سب بیتی، اسی زمانے میں وہ ناتسی گیس چیمبر بھی دن رات کام کر رہے تھے جہاں روزانہ ہزاروں یہودیوں کو موت کے بھینٹ چڑھایا جاتا تھا اور ...... مجھے اس روسی لڑکی کا قصہ یاد آیا۔ اپنے سارے خاندان کو اپنے سامنے جرمن مشین گن کی نذر ہوتے دیکھ کر پل کی پل میں صدمے کی شدت سے اس روسی لڑکی کے بال سفید ہوگئے تھے۔

یہ 1945ء کے بعد روپ کی نوجوان نسل تھی۔

''اب تمہاری ماں کچھ کام کرتی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، وہ محض ایک ''ہاؤس فرا'' ہیں۔ ان کو فوجی بیوہ کی حیثیت سے پنشن ملتی ہے۔ ہمارا چھوٹا سا دو کمروں کا مکان ہے۔ میں شام کی شفٹ میں ایک فیکٹری میں کام کرتا ہوں۔ میری امّاں بہت بھولی بھالی ہیں۔ اسٹرولوجی میں یقین رکھتی ہیں اور پابندی سے گرجا جاتی ہیں۔ پچھلے سال میں نے سائیکل پر سارے جرمنی کا چکر لگایا تھا ...... جرمنی دنیا کا حسین ترین ملک ہے۔''

''ہر ملک اس کے باشندوں کے لیے دنیا کا حسین ترین ملک ہونا چاہیے۔ مگر تم 'نئے ناتسی' نہ بن جانا۔''

''نہیں۔ میں 'نیا ناتسی' نہیں بنوں گا۔ مجھے یہودیوں سے بہت زیادہ نفرت نہیں ہے۔'' اس نے سادگی سے کہا۔ مجھے ہنسی آگئی۔

''میرے نانا اور نانی اب بھی مشرقی جرمنی میں ہیں۔ مگر ہم ان سے نہیں مل سکتے ...... جس طرح آپ کا آدھا خاندان

یہاں ہے، اور آدھا پاکستان میں۔'' اس نے کانٹا اٹھا کر مجھے سمجھایا۔

دوسرے روز اس نے وعدہ کیا کہ شہر کی قابلِ دید جگہیں ضرور دیکھ کر آئے گا۔ مگر وہ اس روز بھی دن بھر رانی باغ میں بیٹھا رہا۔

چوتھا دن اس نے وارڈن روڈ پر بھولا بھائی دیسائی انسٹی ٹیوٹ کے برآمدے میں بیٹھ کر لاؤس کی جنگ کے متعلق مضامین پڑھنے میں گزارا۔ اندر لڑکیاں رقص سیکھ رہی تھیں اور ہال میں حسینؔ کی نئی تصاویر کی نمائش ہو رہی تھی۔ ''لہذا میں ساتھ ساتھ آرٹ و کلچر سے بھی بہرہ ور ہوتا رہا۔'' اس نے واپس آ کر کہا۔

بمبئی میں وہ سارے فاصلے پیدل طے کرتا تھا اور وارڈن روڈ سے فلورافاؤنٹن تک پیدل جاتا تھا۔

''میں آٹھ آنے سے ایک روپیہ روز تک خرچ کرتا ہوں اور زیادہ تر کیلے کھاتا ہوں۔ ہر جگہ بے حد مہمان نواز لوگ مل جاتے ہیں۔ کیا یہ عجیب بات نہیں کہ انسان انفرادی طور پر اس قدر سیدھا سادا اور نیک ہے اور اجتماعی حیثیت میں درندہ بن جاتا ہے ...... ؟'' یہ سوال کرنے کے بعد وہ منہ لٹکا کر بیٹھ گیا۔ اس دن وہ ایک ٹرک کمپنی سے طے کر آیا تھا۔ بنگلور تک ان کے ٹرک پر جائے گا۔ صبح سویرے اس نے اپنے تھیلے میں کتابیں اور کپڑے ٹھونسے، دوسرا تھیلا، جو اس کا سفری خیمہ اور بستر تھا، لپیٹ کر کندھے پر رکھا، خدا حافظ کہا اور ٹراسپورٹ کمپنی کے دفتر فلورافاؤنٹن پیدل روانہ ہوگیا۔

اوٹو کو گئے کئی مہینے گذر گئے۔ الّن ماموں کا خط آیا تو میں نے انھیں شکایتاً لکھا کہ آپ کے بیٹے اوٹو نے یہاں سے جا کر یہ بھی اطلاع نہ دی کہ کمبخت اب کہاں کی خاک چھان رہا ہے۔ میں نے یہ خط پوسٹ کیا ہی تھا کہ ڈاک سے اوٹو کا لفافہ آ گیا۔ اس کے ٹکٹوں پر لاؤس کے بادشاہ کی تصویر بنی تھی اور خط میں لکھا تھا :

''وہ جرمن لڑکا جو آپ کے گھر پر ٹھہرا تھا آپ کو بھُولا نہیں ہے۔ آپ میرے ساتھ بہت مہربان تھیں۔ (میری انگریزی کمزور ہے غلطیاں معاف کیجیے گا) آپ میرے ساتھ بڑی بہن کی سی شفقت سے پیش آئیں اور میں محبت پر بہت یقین رکھتا ہوں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ ابھی بہت کم عمر ہوں، لیکن آپ نے ٹھیک کہا تھا، دنیا میں صرف وہی لوگ خوش رہ سکتے ہیں جو زندگی کو بغیر کسی پس وپیش کے اور بغیر سوالات کئے منظور کرلیں۔ ہم جتنے زیادہ سوالات کرتے ہیں اتنا ہی زیادہ انکشاف ہوتا ہے کہ زندگی کافی مہمل ہے۔

لنکا میں میں نیورا ایلیا سے کنیڈی ایک ٹورسٹ بس کے ذریعے گیا۔ بس میں ایک سنگھالی طالب علم سے میری دوستی ہوگئی۔ اس نے راستے میں مجھے اپنے ساتھ کھانا کھلایا۔ اس کا نام راجہ تھا۔ اس نے میرے لیے پھل بھی خریدے۔ بس میں بہت سے ڈھول رکھے تھے۔ راجہ خوب گانے گاتا رہا۔ آبشار بہت خوبصورت لگ رہے تھے۔ راجہ نے مجھ سے کہا۔ چلو ہم سب نہائیں۔ چند منٹ بعد وہ مرچکا تھا۔ وہ پانی میں ڈوب گیا تھا۔ دو گھنٹے کی تلاش کے بعد اس کی اکڑی ہوئی لاش ہمیں ایک چٹان کے نیچے ملی۔ یہ سب کیا ہے۔ میں سوچتا رہا ہوں کہ یہ کیسے ہوا۔ ہم میں سے کوئی بھی راجہ کو اس حادثے سے بچا نہ سکتا تھا۔ کیا یہ اتفاق تھا یا اسی کو ''قسمت'' کہتے ہیں؟ راجہ اپنے والدین کا اکلوتا لڑکا تھا۔ اس کے بہن بھائی پانچ اور پندرہ کی عمروں کے درمیان مرچکے تھے۔ اس کا باپ نابینا ہے اور ماں بہت بیماری۔ راجہ لوگوں کا بہت کفیل تھا۔

مدرائے میں ایک نوجوان شاعر نے مجھ سے کہا کہ دنیا کی وجہ سے وہ بہت دکھی ہے۔ مدراس میں میں نے ریڈیو انٹریو سے کچھ روپے کمائے۔ پھر میں پیٹانگ گیا جو بڑا خوبصورت جزیرہ ہے اور وہاں بے شمار چینی رہتے ہیں۔

ایک مال گاڑی کے آخری ڈبے میں بیٹھ کر میں بنگ کاک پہنچا اور بدھ خانقاہوں میں مقیم رہا اور راہبوں کے ساتھ کھانا کھاتا رہا۔ دوپہر کو خوبصورت لڑکیاں خوش لباس خواتین اپنی اپنی قسمت اور مستقبل کا حال پوچھنے راہبوں کے پاس آتی تھیں۔

زیادہ تر بھکشو محبت کے بھوکے ہیں اور بے تحاشا تمباکو پیتے ہیں اور کوئی کام نہیں کرتے۔ بوڑھی مذہب پرست خواتین انھیں کھانا اور پیسے دیتی رہتی ہیں۔ بہت سے بھکشو خانقاہوں میں اس لیے بیٹھے ہیں کہ انھیں محنت کرنا اچھا نہیں لگتا۔ یہ لوگ سخت کاہل ہیں، مگر ان کے مذہب میں اس کاہلی کا ایک مقدس جواز موجود ہے ...... نروان کی تلاش ...... بعضے ان میں سے واقعی سنجیدگی سے مراقبے میں مصروف ہیں۔لیکن زیادہ تر بھکشو کھانے اور خواتین سے گپ کرنے کے علاوہ سوتے رہتے ہیں۔

نانگ کائی میں میں میکانگ دریا میں نہایا اس کے بعد لاؤس آ گیا۔

دین تین ایک بڑے سے گاؤں کی مانند ہے۔ دھوپ بہت تیز ہے اور سڑکیں گرد آلود۔ صرف راتیں خوشگوار ہیں کیونکہ اندھیرا ساری بدصورتی،ظلم اور تشدد اور خون ریزی کو اپنے اندر چھپا لیتا ہے مچھر بہت ہیں۔

سوانا تک ایک طیارے میں مجھے مفت کی لفٹ مل گئی اور اب میں پکسے میں موجود ہوں۔ پھر کمبوڈیا جاؤں گا۔ میں انکل انور کے پاس چٹا گانگ نہ جاسکا کیوں کہ برما سے مشرقی پاکستان داخل ہونے میں بڑی دقتیں تھیں۔ میں نے سرخ چین اور شمالی ویٹ نام کے لیے ویزا کی درخواست دی ہے۔ پیکنگ اور ہنوئی سے مجھے پھوم پینہہ میں جواب مل جائے گا۔کل میں یہاں سے جنوبی ویٹ نام جارہا ہوں۔

اس غلط سلط انگریزی کے لیے دوبارہ معافی چاہتا ہوں۔ آپ کا بہت شکر گذار۔

''اوٹو کروگر۔''

فروری 1963ء کے ایک غیر ملکی رسالے میں ''ویٹ نام کی جنگل دار'' کے عنوان سے ایک رنگیں تصویروں والا مضمون چھپا ہے۔ ان تصویروں میں گوریلا سپاہیوں کو بندوقوں کا نشانہ بنایا جارہا ہے۔کشتیوں میں بیٹھے ہوئے گوریلا قیدی میکانگ دریا کے پار لے جائے جارہے ہیں، اور کسان عورتیں یا کشتیاں کھے رہی ہیں۔ کنارے پر پہنچ کر ان قیدیوں کو گولی مار دی جائی گی۔ دھان کے کھیتوں کے پانی میں سے جنگی قیدی گذر رہے ہیں اور مضمون کے آخر میں دو صفحات پر پھیلی ہوئی ایک تصویر ہے۔ جس میں دھان کے ہرے کھیت ہیں اور دھان کی بالیاں ہوا کے جھونکوں سے جھکی جارہی ہیں اور لمبے پتوں والے درخت ہوا میں لہرا رہے ہیں۔ افق پر درختوں کی قطاریں ہیں اور سبزہ اور پانی۔ یہ ایسا دلفریب منظر ہے۔ مصور جس کی تصویریں بناتے ہیں، شاعر نظمیں کہتے ہیں اور افسانہ نگار ''دھرتی کی عظمت'' کے متعلق کہانیاں لکھتے ہیں۔ ان ہرے بھرے درختوں کے پیچھے کسانوں کے پُر امن جھونپڑے ہوں گے اور اس گاؤں کے باسی تنکوں سے بنی ہوئی چھجے دار نوکیلی ٹوپیاں اوڑھے دن بھر پانی میں کھڑے رہ کر دھان بوتے ہوں گے اور گیت گاتے ہوں گے اور فصل تیار ہونے کے بعد منڈی میں جا کر محنت سے اگایا ہوا دھان تھوڑے سے پیسوں میں فروخت کرکے اپنی زندگیاں گزارتے ہوں گے۔ اس ندی کے کنارے لڑکیاں اپنے چاہنے والوں سے ملا کرتی ہوں گی اور

نوجوان مائیں رنگ برنگے سیرونگ پہنے، گھڑے اٹھائے اپنے بچوں کو نہلانے کے لیے دریا پر آتی ہوں گی۔

لیکن اس تصویر میں جو اس وقت میرے سامنے رکھی ہے کٹے پھٹے چہروں والی نیم عریاں اور خون آلودہ نوجوان لاشیں ہیں دور ایک کونے میں بھورے رنگ کا مہیب جنگی طیارہ کھڑا ہے اور تصویر کے نیچے لکھا ہے :

''موت کا کھیت ...... ویت کونگ گوریلے جن کو میکانگ دریا کے دھان کے ڈیلٹا میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ان کے ساتھی ایک دوسرے کے ساتھ رسیوں سے بندھے سرجھکائے ایک کونے میں بیٹھے ہیں۔ اس خوں ریز دست بدست لڑائی میں ایک نوجوان بچ ہائیکر بھی جو میکانگ دریا کے کنارے سے گذر کر شمالی ویٹ نام جارہا تھا، ایک اتفاقیہ گولی کا نشانہ بن گیا۔ اس خوبصورت ملک میں یہ بھیانک خانہ جنگی 1944ء سے جاری ہے اور ......''

اوٹو کروگر زندگی کا تجربہ حاصل کرنے دنیا کا سفر پہ نکلا تھا۔

الفاظ و معانی

کینوس ولایتی ٹاٹ **راہب** عیسائی عابد یا زاہد **خاک آلودہ** مٹی سے بھرا ہوا **خانقاہ** درویش کا مزار **سرخم** سرجھکا کر **نروان** نجات **عمرانیات** انسانی معاشرت **افق** آسمان کا کنارہ **ثقیل** بھاری **عریاں** برہنہ **مدلل** دلیل سے ثابت کیا ہوا **نشست** بیٹھک **بشاش** تروتازہ **ندامت** شرمندگی **قہر ناک** بھیانک **اسٹرولوجی** جیوتش **کفیل** ذمہ دار

مشق

1. مندرجہ ذیل معروضی سوالات کے صحیح جواب پسند کر کے لکھیے :

(1) اوٹو کے پاس کتنے پیسے تھے؟

(الف) 100 روپے (ب) 20 روپے (ج) بالکل نہیں (د) 50 روپے

(2) الّن ماموں نے اوٹو کے ہاتھ کیا بھیجی؟

(الف) پیسہ (ب) کپڑے (ج) خط (د) کتابیں

(3) اوٹو کی کتنی عمر تھی؟

(الف) 22 (ب) 24 (ج) 21 (د) 26

(4) اوٹو بیل گاڑی میں بیٹھ کر کہاں گیا؟

(الف) سری لنکا (ب) ویٹام نام (ج) بنگ کاک (د) بمبئی

(5) وکٹوریہ گارڈن میں اوٹو نے کتنے کیلے کھائے؟

(الف) 6 (ب) ایک درجن (ج) 3 (د) 4

.2 دو تین جملوں میں جواب لکھیے :

(1) اوٹو نے پاکستان اور ہندوستان میں کیا فرق پایا؟

(2) اوٹو کے پاس کون کون سی کتابیں تھیں؟

(3) اوٹو بمبئی میں کن کن مقامات پر گیا؟

(4) سری لنکا میں اوٹو کی دوستی کس سے ہوئی؟

(5) چوتھے دن ممبئی کے کس مقام پر اوٹو گیا اور کیا منظر دیکھا؟

.3 تفصیلی جواب لکھیے :

(1) اوٹو کا حلیہ بیان کیجیے۔

(2) مصائب نے ان کو قبل از وقت بوڑھا کردیا ہے۔مگر وہ اب بھی دنیا کی حسین ترین عورت ہیں۔سمجھایئے۔

(3) خط میں اوٹو نے افسانہ نگار کو کس حادثہ کا ذکر کیا؟

(4) ''انسان سب سے بڑا دیوتا ہے'' جملہ سمجھایئے۔

(5) میکانگ دریا کا منظر بیان کیجیے۔

.4 جامع لفظ لکھیے :

(1) جس کے ذریعے لوگ ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے ہیں۔

(2) وہ شخص جس کے یہاں مہمان آئے۔

(3) فرشتہ کی طرح خوبی رکھنے والا۔

(4) ملک ملک کی سیر کرنے والا۔

(5) جو شاعری نغمے کی طرح گائی جاتی ہو۔

(6) اونچائی سے گرنے والا پانی۔

(7) کھانے پینے کا سامان رکھنے کی جگہ۔

.5 حروفِ عطف پہچانیے :

(1) میں ترکی اور ایران ہوتا ہوا آیا ہوں۔

(2) وہ جرمن لڑکا جو آپ کے گھر پر ٹھہرا تھا۔

(3) اس نے میرے لیے پھل بھی خریدے۔

(4) میرے نانا اور نانی اب بھی مشرق جرمنی میں ہیں۔

.6 مرکب الفاظ :

قہرناک   خاک آلودہ   لرزہ خیز   عالم گیر   برآمد

●

24 غزل

حسن نعیم

پیدائش : 1924ء وفات : 1991ء وطن : پٹنہ

نام سید حسن والد کا نام سید نعیم۔ ادبی نام حسن نعیم کے نام سے مقبول عام ہوئے۔ ابتدائی تعلیم شیخ پورہ منگیر میں حاصل کی۔ میٹرک کالج اور پھر آئی ایس سی کا امتحان پٹنہ سے پاس کیا۔ مسلم علی گڑھ یونیورسٹی سے بی ایس سی کا امتحان پاس کیا۔ 14 سال کی عمر ہی سے شعر کہنے لگے تھے۔ علی گڑھ شروع ہی سے اردو شعرو ادب کا مرکز رہا ہے لہذا علی گڑھ کے دوران قیام خیال الرحمٰن اعظمی سے مشورے پر غزلوں کی طرف خصوصی توجہ دی۔ 1949ء میں شادی ہوئی 1952 میں ایم۔ اے۔ او ہائی اسکول کلکتہ میں سائنس ٹیچر رہے۔ 1953ء میں ڈاکٹر سید محمود چیرمین ہسٹری آف فریڈم مومنٹ بورڈ کے سکریٹری منتخب ہوئے۔ 1958ء سے ساڑھے تین سال جدہ میں ہندوستان کے نائب کونسل رہے۔ پھر نیورک میں چار سال تک انڈین مشن برائے اقوام متحدہ سے منسلک رہے۔

حسن نعیمؔ کی تصنیاف میں 1971ء میں 'اشعار' 1980ء غزل نامہ ہندی رسم الخط میں 1992ء مجموعہ کلام ''دبستان'' 1994ء ''اردو سخنوران شیریں'' اور 2006ء میں کلیات حسن نعیم شائع ہوا۔

ہوا میں رقصاں ہیں دل کے پرزے خرد کے طوفاں کا سلسلہ ہے
جنوں کی بستی اجڑ چکی ہے، وفا کے شہروں میں زلزلہ ہے

میں جس کو وحشت میں ڈھونڈتا تھا، ہر ایک جنگل ہر ایک قریہ
وہ مصلحت کا لبادہ اوڑھے، صفِ عدو کے قریں ملا ہے

وجودِ دامن سے کچھ زیادہ، ورودِ گل پر ہوا میں حیراں
ہر ایک کانٹے سے پوچھتا تھا، ''یہ پھول کس کے لیے کھلا ہے؟''

ہزار سمتوں سے آئے پتھر، مگر جو دل کے مکیں نے پھینکا
اسی کو خلوت میں چومتا ہوں کہ لاکھ سجدوں کا یہ صلہ ہے

نعیمؔ جینے کی آرزو ہے تو آؤ مرنے کا ڈھنگ سیکھیں
یہی دیارِ بتاں کی رسمیں، یہی زمانے کا فیصلہ ہے

الفاظ و معانی

کنج چمن چمن میں درختوں کے سائے میں بیٹھنے کی جگہ، بیل بوٹوں کی جگہ **صرصر** آندھی **قریہ** گاؤں - جمع، قریٰ **عدو** دشمن

مشق

1. سوالوں کے جواب لکھیے :

(1) جنوں کی بستی کے اجڑنے سے اور ''وفا کے شہروں میں زلزلہ سے'' شاعر کی کیا مراد ہے؟

(2) شاعر تنہائی میں اپنی طرف پھینکے گئے پتھر کو کیوں چومتا ہے؟

(3) شاعر نے مرنے کے ڈھنگ یا طریقے سیکھنے کا کیوں کہا ہے؟

(4) شاعر ہر ایک کانٹے سے کیا پوچھنا چاہتا ہے؟

2. تشریح کیجیے :

(1) ہزار سمتوں سے آئے پتھر، مگر جو دل کے مکیں نے پھینکا
اسی کو خلوت میں چومتا ہوں کہ لاکھ سجدوں کا یہ صلہ ہے

(2) نعیمؔ جینے کی آرزو ہے تو آؤ مرنے کا ڈھنگ سیکھیں
یہی دیارِ بتاں کی رسمیں، یہی زمانے کا فیصلہ ہے

●

25 آخری شو (ملیالم کہانی)

پول زکریا

پول زکریا 1945ء میں کیرالا کے ضلع کوٹیم میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے میسور میں یونیورسٹی سے انگیریزی میں ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ بعد ازاں انھوں نے بطور لکچرر، صحافی، مدیر، ناشر اور کاشت کار خدمات انجام دیں۔ فی زمانہ وہ انڈیا ٹوڈے (ملیالم) اور ایشیا نیٹ ٹی وی نیٹ ورک کے مشیر ہیں۔ انھوں نے مختصر کہانیوں کے آٹھ مجموعے، مضامین کے تین مجموعے اور ایک اسکرین پلے شائع کیا۔ انھوں نے مختصر کہانی کے لیے کیرالا ساہتیہ اکادمی کا انعام جیتا ہے۔ وہ اخبارات کے لیے کالم لکھتے ہیں اور ٹی وی پر مطبوعہ تخلیقات کی بابت ہفتہ وار تبصرے پیش کرتے ہیں۔ ان کا قیام تھیروو اننتھا پورم میں ہے۔

ہیروئن زہر کھا لیتی ہے۔ کیوں کہ وہ سوچتی ہے کہ اس کے عاشق نے اس کو چھوڑ دیا ہے۔ درحقیقت ہیرو اس سے دوری اختیار کرنے کا ڈھونگ کرتا ہے اور اپنی شدید محبت کو اس لیے اس سے چھپاتا ہے کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ وہ خون کے کینسر کا مریض ہے۔ وہ ایک مفلسی کا مارا مُغنّی تھا لیکن کامیابی کو حاصل کرنے میں رئیس ہیروئن نے اس کی بڑی مدد کی تھی۔ ہیرو کے شدید تغافل سے ناامیدی میں ڈوبی ہیروئن اپنے باپ کی ترغیب پر کسی دوسرے شخص سے شادی کرنے کے لیے رضا مند ہوجاتی ہے۔ اس کا منگیتر وہی ڈاکٹر ہے جو اس کے عاشق کے کینسر کی تشخیص کرتا ہے لیکن وہ اس حقیقت سے ناآشنا ہے۔ وہ مدورئی میں رہتا ہے اور ہیرو اور ہیروئن مدراس میں رہتے ہیں۔ مرض کی تشخیص اس وقت ہوتی ہے جب ہیرو ایک موسیقی کی محفل کے لیے مدورئی گیا تھا۔ ہیروئن کا منگیتر سگائی کی رسم کی ادائیگی کے لیے مدراس آپہنچتا ہے وہ اتفاق سے ہیرو سے ملتا ہے اور اس کو ہیروئن اور اس کے باپ سے تعارف کراتا ہے۔ وہ قطعاً ان تمام عشقیہ معاملوں سے انجان ہے جو اس کے مریض اور منگیتر کے درمیان رونما ہوچکے ہیں۔

کیسی دلفریب صورت حال ہے! میں اپنے منہ میں ''پٹّو کاڈلا (Pattu Kadla) کو چبانا بھول گیا جیسے ہی میں اس ملاقات کی کیفیت سے لطف اندوز ہوا۔ بہ ہرکیف، ہیروئن اپنے منگیتر سے اس المیہ حقیقت کو بہ خوبی جان لیتی ہے اور اس گہرے صدمہ کی تاب نہ لاکر وہ زہر کھالیتی ہے۔ اس المناک خبر کو سن کر اس کا منگیتر اس کمرے کے بند دروازے کی طرف دیوانہ وار جھپٹتا ہے۔ بہ یک وقت اس کا عاشق بھی اپنے بستر مرگ سے نہایت والہانہ انداز سے لپکتا ہے۔ ہیروئن نہایت کرب کے عالم میں دروازے کی طرف آہستہ آہستہ جاتی ہے، اس کو کھولتی ہے۔ ایک لمحے کے لیے اپنے عاشق پر اپنی نظروں کو مرکوز کرتی ہے اور زمین پر گرپڑتی ہے اور دم توڑ دیتی ہے۔ اس کا عاشق بھی کھلے ہوئے دروازے سے داخل ہوکر اسی کمرے میں نہایت بے بسی کے عالم میں گرجاتا ہے اور اس کے پہلو میں آخری سانس لیتا ہے۔

اس سانحے سے پہلے ایک پر اسرار مسکراہٹ ہیروئن کے چہرے کو منور کردیتی ہے۔ جیسے ہی وہ نیم وا دروازے سے ہیرو کو دیکھتی ہے۔ اس مسکراہٹ نے میرے جسم و جاں کو گدگدا دیا کہ سب کچھ ٹھیک ہی ہوگا۔ اب بھی امکان ہے کہ ان تمام چیزوں کا خاتمہ بہ خیر ہوگا۔ مجھ کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہیروئن کا منگیتر جو ایک ڈاکٹر تھا اور بہ یک وقت ایک اعلیٰ کردار کا آدمی بھی تھا،

ان دونوں کو بچانے میں یقینا کامیاب ہوگا۔ ہیرو اور ہیروئن پھر اپنے دل کی گہرائیوں سے اس کا شکریہ ادا کریں گے اور اپنی زندگی کے ایک نئے دور میں داخل ہوں گے۔ ایسا میں توقع کرتا تھا کہ یہ سب اس کی مسکراہٹ کی توانائی سے وجود پذیر ہوگا لیکن اس کے برخلاف جو واقعتا ہوتا ہے کہ منگیتر اور دوسروں کی نظروں کے سامنے دونوں شاخ سے جدا ہوتے پتوں کے مانند گرتے ہیں اور بے اختیار مرجاتے ہیں جب کہ منگیتر اور دوسرے لوگ سراسیمگی کے عالم میں دیکھتے ہیں اور ایک ساکن شاٹ (ٹھہرائے ہوئے فلمی منظر) میں محبوس ہوجاتے ہیں اور محبوب اور محبوبہ بھی ایک ساکن شاٹ (ٹھہرائے ہوئے فلمی منظر) میں غیر متحرک ہوجاتے ہیں۔ اس کے بعد وہاں صرف پردۂ سیمیں ہے اور ناظرین کے سر کے سائے ہیں جیسے ہی وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہیں اور پروجیکٹر (عکس انداز) کی دم توڑتی روشنی کے درمیان سے گزرتے ہیں۔

میں سنیما ہال کے خالی کو ریڈیو سے گزرا اور پروجیکشن روم (عکس ریز کمرے) سیڑھیوں سے چڑھ کر داخل ہوا اور میں نے ذرا سا دروازہ کھولا۔ پروجیکشنسٹ (عکس فن) فلم کی ریل کو پھر سے لپیٹ رہا تھا۔

میں نے اس سے کہا ......''ہیرو اور ہیروئن کے لیے بہت سارے دوسرے امکانات کھلے ہوئے تھے۔ ان کی زندگی کے رخ کو بدلنے کے لیے بہت سارے واقع تھے۔''

اس نے ایک گول ڈبے میں ریل کو رکھ دیا۔ میں نے اس سے کہا ......''اسی نقطے سے کل ہم فلم کو پھر سے شروع کریں جس نقطے پر ہیروئن کے ہونٹوں پر ایک پُر اسرار مسکراہٹ طلوع ہوتی ہے اور ان تخلیقی امکانات کو بہ روئے کار لاتے ہیں جو یہ مسکراہٹ عطا کرتی ہے اور نہیں تو ہم ایک دو ریل کو روک سکتے ہیں اور ان میں تبدیلی لاسکتے ہیں مثلاً اگر ہیرو موسیقی کی محفل کے لیے مدورئی نہیں جاتا ......''دیکھو! ہم کو ان ریل کے ڈبوں کو کھولنے دو اور دیکھنے دو کہ ہم مزید کیا کرسکتے ہیں؟ کیا تمہارے پاس کنجی ہے؟

میں پروجیکٹر (عکس انداز) کے نرم قالب کا سہارا لے کر کھڑا ہوگیا اور اس کے ذہن کو کئی دوسرے متبادلات اور جہات کی طرف مرکوز کیا کہ جن کی طرف ہیرو اور ہیروئن کی زندگی گامزن ہوسکتی ہے۔ میں نے اس سے کہا ......'' مرتے وقت ہیروئن کی آخری مسکراہٹ مجھ کو بے انتہا مضطرب کرتی ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ ایک پوری زندگی اس سے خصوصی شکل اختیار کرسکتی ہے۔ ایسا اس خصوصی شکل میں کیوں نہیں ہوا؟ کیا تم میری ذرا بھی مدد نہیں کرسکتے؟''

اس نے مجھ سے کہا ......''یہ آخری شو تھا میرے دوست! یہ ریل کے ڈبے کل واپس ہوجائیں گے۔

اس نے ایک بڑے ڈبے میں آکری ریل کیس کو رکھ دیا اور اس کو بند کردیا۔ پھر اس نے پروجیکٹر کے جھرو کے سے ایک ٹارچ کو روشن کیا اور سنیما ہال کے اندر دیکھا۔ میں نے پردۂ سیمیں کی ایک جھلک کے لیے اس کے شانے کے اوپر سے ایک نگاہ ڈالی۔ لیکن ٹارچ کی مدھم روشنی ٹمٹمائی اور پردۂ سیمیں تک نہ پہنچ پائی اور ہال کی طویل تر تاریکی میں گم ہوگئی۔

اس نے ایک سوئچ کو دبا اور ایک دوسری کھڑکی کھولی۔ روشنیوں نے ستاروں کے مانند چھت کے اندرونی حصے کو منور کردیا۔ ہم نے تھوڑی دیر تک روشنیوں کو دیکھا۔ پھر اس نے کہا: ''کاش وہاں اس طرح صرف ایک چاند بھی ہوتا۔'' میں نے کہا ......''ہم بادلوں کی ضرورت بھی محسوس کرتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے نا!'' اس نے کہا ......''اور آندھی اور بجلیوں کی کوندتی لکیریں بھی

...... اور سورج کے طلوع اور غروب کے امکان بھی!'' اس نے جھرو کے کو بند کردیا۔''اور شام کو اپنے گھونسلوں کی جانب واپسی کے لیے چڑیاں بھی'' میں نے کہا۔

جیسے ہی میں تاریکی میں سیڑھیوں سے لڑکھڑاتے ہوئے نیچے گیا میں نے دور آسمان کی جانب دیکھا اور افق پر چاند کے طلوع ہونے کے علامات نامعلوم ایک ''قعرِ آتشیں'' سے نمایاں ہورہے تھے۔

الفاظ و معانی : تشخیص جاننا، پہچاننا، جانچ، شناخت سانحہ صدمہ پہنچانے والا واقعہ، حادثہ قعر گہرائی والہانہ عاشقانہ انداز سے متادلات بدلنے والا جہات (جہت کی جمع) اطراف، سمتیں محبوس مقید، قید میں رکھا گیا، اسیر مُغنّی گانے والا، گوتا، میراثی افق وہ جگہ جہاں زمین و آسمان ملے ہوئے دکھائی دیتے ہیں

مشق

.1 مندرجہ ذیل سوالوں کے جواب ایک جملے میں لکھیے :

(1) ہیرو اپنے شدید محبت کے جذبہ کو کیوں چھپانا چاہتا تھا؟

(2) ہیروئن دوسرے شخص سے شادی کرنے پر کیوں رضا مند ہوجاتی ہے؟

(3) ہیرو کے مرض کی تشخیص کب ہوتی ہے؟

(4) ہیروئن کا منگیتر ہیرو کو کس سے متعارف کراتا ہے؟

.2 مندرجہ ذیل سوالوں کے جواب لکھیے :

(1) ہیروئن کی پُر اسرار مسکراہٹ سے مصنف نے کیا محسوس کیا؟

(2) مصنف کی توقع کے خلاف کون سا منظر ان کے سامنے آتا ہے؟

(3) عاشق و معشوق کی موت کا سانحہ اپنے الفاظ میں لکھیے۔

(4) مصنف پروجیکٹر کے ذہن کو کون سے متبادلات کی طرف مرکوز کرنا چاہتے تھے؟

.3 ضدیں لکھیے :

آشنا رئیس عاشق متحرک (جادی) طویل۔ تاریکی

.4 سمجھایئے :

لطف اندوز رضا مند المناک سراسیمگی قعرِ آتشیں دلفریب

.5 جملے بنایئے :

نا آشنا ہونا متعارف کرانا گامزن ہونا مضطرب ہونا

●

26 مجھ سے پہلے سی محبت مری محبوب نہ مانگ

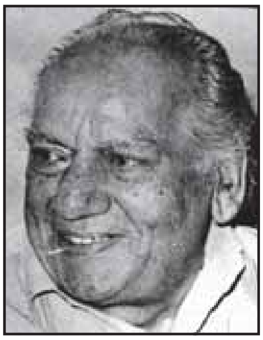

فیض احمد فیضؔ

پیدائش : 1911ء وفات : 1984ء وطن : پنجاب

فیض احمد نام اور فیضؔ تخلص کرتے تھے۔ فیضؔ نے اپنی شاعری کی ابتداء غزلوں سے کی انھیں غزل گوئی اور نظم نگاری دونوں میں یکساں مہارت حاصل تھی۔ فیضؔ نے انٹرنس کی تعلیم سیالکوٹ میں حاصل کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور سے انگریزی میں اور اورینٹل کالج لاہور سے عربی میں ایم۔ اے کے امتحان پاس کیے۔ آپ ایم۔ اے۔ او کالج امرتسر میں انگریزی کے لکچرر مقرر ہوئے۔ آپ پاکستان ٹائمز کی ادارت سے بھی وابستہ رہے۔

فیضؔ کالج کے زمانے سے ہی شعر کہنے لگے تھے۔ فیضؔ کی نظموں میں رومان اور حقیقت کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ عرفان ذات اور عرفان کائنات کی حدود ملتی اور ایک دوسرے میں ضم ہوتی دیکھائی دیتی ہے۔ اردو نظم کے کسی شاعر نے محبت کے جزبے کو اتنی شدت اور خلوص کے ساتھ پیش نہیں کی۔ جتنی شدت اور خلوص فیض کے یہاں موجود ہے۔

فیضؔ ترقی پسند شاعروں میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک خطابیہ شاعر کا مطالبہ کرتی ہے، لیکن فیضؔ نے یہاں بھی اپنی راہ الگ نکالی ہے۔

مجھ سے پہلے سی محبت مری محبوب نہ مانگ
میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے درخشاں ہے حیات
تیرا غم ہے تو غمِ دہر کا جھگڑا کیا ہے
تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے؟
تو جو مل جائے تو تقدیر نگوں ہوجائے
یوں نہ تھا، میں نے فقط چاہا تھا یوں ہوجائے
اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
اَن گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخاب میں بنوائے ہوئے
جابجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے

لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجیے
اب بھی دلکش ہے ترا حسن، مگر کیا کیجیے

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

الفاظ و معانی

درخشاں چمکتا ہوا، روشن **حیات** زندگی **دہر** دنیا **ثبات** پائیداری، قائم **وصل** ملاقات **بہیمانہ** حیوانوں کی طرح **تاریک** اندھیرا **طلسم** جادو **کمخاب** ایک قسم کا ریشمی کپڑا جو زری کے تاروں کی آمیزش سے بنایا جاتا ہے **اطلس** ایک قسم کا ریشمی کپڑا

مشق

1. مندرجہ ذیل سوالات کے جواب لکھیے :

(1) محبوب کی موجودگی کو شاعر کیا خیال کرتا تھا؟

(2) محبوب کی صورت کے متعلق شاعر نے کیا کہا ہے؟

(3) سمجھائیے :

تو جو مل جائے تو تقدیر نگوں ہو جائے
یوں نہ تھا، میں نے فقط چاہا تھا یوں ہوجائے

2. نظم کا خلاصہ لکھیے :

•

27 مرزا غالبؔ کی حویلی

قاضی مشتاق احمد

پیدائش : 1940ء

قاضی مشتاق احمد اردو ادب کا وہ معتبر نام ہے۔ جس سے بے شمار افسانے، ناول، ڈرامے جڑے ہوئے ہیں۔ قاضی مشتاق احمد کا شمار ملک کے مشہور افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ وہ مختلف موضوعات پر تیس سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں۔ انھوں نے کئی ڈرامے بھی تحریر کیے ہیں۔ ان کا تحریر کردہ ڈرامہ 'مرزا غالبؔ کی حویلی' کے تخلیق کار کی حیثیت سے انھیں کافی شہرت ملی ہے۔ اردو زبان کا یہ پہلا ڈرامہ ہے جسے ممبئی کے سب سے بڑے ثقافتی میلہ 'کالا گھوڑا فیسٹیول' میں پیش ہونے کا اعزاز ملا۔

'آتش کشمیر'، 'بے نام رشتے'، 'آزاد کا خواب' اور بہادر شاہ ظفر کی زندگی پر مبنی ڈرامہ 'آخری مغل' ان کے کامیاب اور مشہور ڈرامے ہیں۔

(سین-1)

(پردہ اٹھتا ہے۔ غالبؔ کی حویلی کا دیوان خانہ نظر آتا ہے، جہاں غالبؔ اپنے دوستوں کے ساتھ شطرنج کھیل رہے ہیں۔)

بیگ گراونڈ آواز :

یہ اردو زبان کے عظیم شاعر مرزا اسداللہ خان غالبؔ کی حویلی ہے۔ اس حویلی میں مرزا غالبؔ ایک کرایہ دار کی حیثیت سے رہتے تھے۔ انھوں نے اس حویلی میں اپنی زندگی کے آخری دن گزارے۔ غالبؔ کی شاعری کا آغاز 1807ء میں ہوا۔ ابتدا میں انھوں نے اپنا تخلص اسدؔ رکھا تھا۔ لیکن اس تخلص کے ایک اور شاعر تھے اس لیے 1816ء میں انھوں نے اپنا تخلص غالبؔ رکھ لیا۔ غالبؔ کے زمانے میں غالبؔ کی حویلی ایک مشہور پتہ تھا۔ غالبؔ کے نام سیکڑوں خطوط آتے تھے، بلکہ ایسا بھی ہوتا تھا کہ ڈاک کا ہرکارہ دن میں دو دو بار خطوط لے کر آجاتا تھا۔

(کھیل ختم ہوجاتا ہے۔ دوست اٹھ کر دیوان پر بیٹھ جاتے ہیں)

ایک : (غالبؔ سے) مرزا صاحب! یہ ''روغن گل بھینس کے انڈے نکال'' والا معاملہ سلجھایا نہیں؟

غالب : معاملہ کیا سلجھاتا۔ الجھ گیا ہے۔ مولوی عبدالقادر نے از راہِ مذاق یہ شعر موزوں کیا :

پہلے تو روغن گل بھینس کے انڈے سے نکال
پھر دوا جتنی ہے، کل بھینس کے انڈے سے نکال

اور یہ شعر ہمارے نام منڈھ دیا۔ وہ جتانا چاہتے تھے کہ اس قسم کے اشعار میرے دیوان میں ہیں، میں نے سارا دیوان چھان مارا ایسا کوئی بھی شعر اس میں نہیں ہے۔

دوسرا : لیکن اس قسم کی افواہوں سے آپ کے بارے میں غلط تاثر پیدا ہوتا ہے۔

غالبؔ : ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسدؔ
کھلا کہ فائدہ عرض ہنر میں خاک نہیں

تیسرا : مرزا صاحب ! یہ آپ کے دو دو تخلص اسدؔ اور غالبؔ بھی آپ کے لیے پریشانی کے باعث ہوں گے۔

غالبؔ : صحیح فرمایا آپ نے۔ ایک صاحب نے مجھے آگرہ سے لکھا کہ آپ کی غزل ''اسدؔ اور لینے کے دینے پڑے ہیں'' بھیج دیجیے۔ لاحول ولاقوۃ۔ میاں ! اگر یہ میرا کلام ہو تو مجھ پر لعنت۔ زمانۂ سابق میں ایک صاحب نے میرے سامنے یہ مطلع پڑھا :

اسدؔ ! اس جفا پر بتوں سے وفا کی
مرے شیر ! شاباش، رحمت خدا کی

میں نے کہا کہ حضرات ! جس بزرگ کا یہ مطلع ہے، اس پر بہ قول اس کے رحمت خدا کی۔ اگر میرا ہو تو مجھ پر لعنت۔ 'اسدؔ اور شیر' بت اور خدا' 'جفا اور وفا' میری طرز گفتار نہیں۔

دوسرا : اس شعر میں اسدؔ بھی ہے۔

غالبؔ : اسدؔ کے ساتھ شیر بھی ہے۔ پھر شعر میرا کیسے ہوگیا؟ اس لیے عرض کیا ہے۔

غالبؔ ! بُرا نہ مان جو واعظ بُرا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے؟

ایک : جناب کا روئے سخن کس کی طرف ہے یہ ہم سمجھ رہے ہیں، حضور ! ہم سخن فہم ہیں غالبؔ کے طرفدار نہیں۔

غالبؔ : جناب عالی ! جب بادشاہ سلامت کو غلط فہمی ہوسکتی ہے تو کسی اور کو کیوں نہیں، بات اتنی سی تھی کہ مرزا جواں بخت کی شادی کے موقع پر کہے سہرے میں یہ شعر نکل آیا :

ہم سخن فہم ہیں غالبؔ کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بڑھ کر سہرا

بادشاہ سلامت کو غلط فہمی ہوگئی کہ روئے سخن استاد ذوقؔ کی طرف ہے۔ بادشاہ سلامت نے فرمائش کی کہ استاد ! اس زمین پر اسی وقت سہرا لکھیے اور استاد نے فرمایا :

جس کو دعویٰ ہو سخن کا یہ سنا دے اس کو
دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

ایک : اور جناب کا پلٹ وار بھی خالی نہیں گیا۔ آپ نے معذرت نامہ لکھا اور ایک تیر سے دو شکار ہوئے :

منظور ہے گزارشِ احوال واقعی
اپنا بیاں حسنِ طبیعت نہیں مجھے
سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

غالبؔ : کیا جناب یہ جانتے نہیں کہ ہمارے دادا مرحوم، والد بزرگوار اور چچا مرحوم سب فوج کے سردار تھے؟

ایک : ہم دلی والے تو یہ بھی جانتے ہیں کہ استاد ذوقؔ کے والد ایک معمولی سپاہی تھے۔ یہ ان کی کم نسبتی پر طعنہ اور 'روئے سیاہ' موصوف سیاہ فامی پر چوٹ۔

غالبؔ : دیکھیے ! ہم نے اپنے آپ کو اس قسم کی چشمکوں سے ہمیشہ دور رکھا ہے لیکن کیا آپ استاد ذوقؔ کا وہ شعر بھول گئے :

نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب
ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

دوسرا : استاد ذوقؔ کا قلندرانہ مزاج ان کے اس شعر میں عیاں ہے :

جس شخص کو سگِ دنیا نہ پایا
فرشتہ اس کو ہم پایہ نہ پایا

غالبؔ : خیر جناب !

نہ ستائش کی تمنا ، نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

دوست : اب اجازت چاہیں گے۔ (اٹھ کھڑے ہوجاتے ہیں) اگر اعتراض نہ ہو تو اگلے دو شنبہ کو یہاں جمع ہوکر کچھ دوستوں کے ساتھ غزل خوانی کر لیتے ہیں، مصرع طرح آپ طے فرما دیں۔ اچھی خاصی محفل جم جائے گی۔

غالبؔ : جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
ایک تماشہ ہوا گلہ نہ ہوا

دوست : یہ تو محبت چند روز ہے۔ اس کو دوام کہاں؟ آج کل شہر میں ویسے بھی مشاعرے نہیں ہوتے۔

غالبؔ : بس شہزادگانِ تیمور جمع ہوکر غزل پڑھ لیتے ہیں۔ میں کبھی اس محفل میں جاتا ورکبھی نہیں جاتا۔

کوئی دن گر زندگانی اور ہے
اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

دوست : آپ ہی نے فرمایا ہے :

ہر چند کہ دوستی میں کامل ہونا
ممکن نہیں یک زباں و یک دل ہونا

غالبؔ : دوست، غمخواری میں میری سعی فرمادیں گے کیا؟

زخم کے بھرنے تلک، ناخن نہ بڑھ جاویں گے کیا!

دوست : (قہقہہ مار کر ہنستے ہوئے) اگلی ملاقات تک ناخن بھی تیز کر لیتے ہیں۔

(دوست رخصت ہونے لگتے ہیں۔ مرزا غالبؔ شمع لے کر دروازے تک آتے ہیں)

دوست : قبلہ ! آپ نے کیوں زحمت اٹھائی؟ ہم جوتا خود ہی پہن لیتے۔

غالبؔ : جناب ! میں آپ کو جوتا دکھانے کو شمع نہیں لایا بلکہ اس لیے لایا ہوں کہ کہیں آپ میرا جوتا نہ پہن لیں۔

(فیڈ آوٹ)

(سین-2)

مقام : حویلی کا دیوان خانہ

(مرزا غالبؔ ایک چھٹی پڑھ رہے ہیں اور زیر لب تبسم بھی ہے۔ ایک نوکر آتا ہے اور کہتا ہے : ''حضور! بیگم صاحبہ تشریف لے آئی ہیں۔'' نوکر یہ کہہ کر باہر چلا جاتا ہے اور غالبؔ کی بیگم امراؤ بیگم ہاتھ میں برقعہ لیے اندر آتی ہے)

غالبؔ : آیئے بیگم صاحبہ ! ہم آپ ہی کا انتظار کر رہے تھے۔ کہیے مکان دیکھ آئیں؟ پسند آیا۔

بیگم : کیا خاک پسند آتا؟ لوگ کہتے ہیں اس میں کوئی بلا رہتی ہے۔

غالبؔ : (ہنستے ہوئے) کیا آپ سے بڑھ کر بھی کوئی بلا ہوسکتی ہے؟

بیگم : (ناراضگی کے ساتھ) ہائے نوج! کیا میں بلا ہوں؟

غالبؔ : بیگم صاحبہ! مذاق کو سمجھا کیجیے۔ بھلا آپ کیسے بلا ہوسکتی ہیں آپ تو جانِ غالبؔ ہیں۔

بیگم : یہ بتایئے آپ ہنس کیوں رہے تھے؟ جب میں اندر آئی آپ کے ہاتھ میں ایک چھٹی بھی تھی۔

غالبؔ : آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

بیگم : کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔

غالبؔ : آپ سے کیسی پردہ داری! اس عمر میں حسینوں کے خطوط تو آنے سے رہے۔ گوپال تفتہؔ کی چھٹی آئی ہے۔ ان نے میرٹھ سے ایک ہُنڈی بھی بھیجی ہے۔

بیگم : اچھا تو آپ اس بات پر ہنس رہے تھے کہ چلیے کچھ دنوں کے لیے سہی آب و دوانہ کا انتظام ہوگیا۔

غالبؔ : ہر گوپال تفتہؔ کو میں نے اپنے جان و دل میں جگہ دی ہے۔ دوسرے ہیرا سنگھ اور شیورام جی برہمن ہیں۔ دونوں میرے بیٹے کی جگہ ہیں۔

بیگم : اور وہ امراؤ سنگھ جوہر۔

غالبؔ : رشک آتا ہے امراؤ سنگھ کی قسمت پر۔

بیگم : کوئی خوش خبری ہے؟

غالبؔ : امراؤ سنگھ کی دوسری بیوی کا انتقال ہوگیا۔ گوپال سنگھ نے ہی خبر دی ہے۔

بیگم : اور آپ اس خبر کو پڑھ کر ہنس رہے ہیں؟

غالبؔ : اجی! کیا جوہر دکھایا ہے امراؤ سنگھ نے۔ دوسری بیوی بھی مرگئی۔ دوبار ان کی بیریاں کٹ گئیں اور ہم ہیں کہ پچاس

برس سے اوپر پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے۔ نہ پھندا ٹوٹتا ہے نہ دم نکلتا ہے۔

بیگم : اچھا تو ہم پھانسی کا پھندا؟ اور وہ کون تھی جو بیڑیاں توڑ کر چلی گئی۔

غالبؔ : کیا فرمایا آپ نے!

بیگم : آپ خوب سمجھ رہے ہیں کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں۔ اب بیٹھے تصورِ جاناں کیے ہوئے اور ہمیں اجازت دیں۔

(بیگم اٹھ کر اندر چلی جاتی ہیں)

غالبؔ : (خود کلامی) مرزا حاتم علی مہرا! آپ کا غم افزا نامہ پہنچا۔ میں نے پڑھا۔ یوسف علی عزیز سے مرحومہ اور آپ کا معاملہ سنا۔ اس کی اطاعت اور تمہاری اس سے محبت، سخت ملال اور رنج کمال ہے۔ بھئی! مغل بچے بھی غضب ہوتے ہیں۔ جس پر مرتے ہیں اس کو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مغل بچہ ہوں۔ عمر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے مار رکھا ہے۔ خدا ان دونوں کو بخشے اور ہم تم دونوں کو بھی کہ زخم مرگ دوست کھائے ہوئے ہیں۔ چالیس بیالیس برس کا یہ واقعہ ہے۔ یہ کوچہ چھڑ گیا۔ اس فن سے میں بے گانہ محض ہوگیا۔ لیکن اب بھی کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں۔ اس کا مرنا زندگی بھر نہ بھولوں گا۔

(اسٹیج پر بجلیاں کوندتی ہیں اور بجلیوں کی گڑگڑاہٹ میں ایک نوجوان خوبصورت عورت سفید کپڑوں میں نظر آتی ہے۔ یہ وہی ڈومنی ہے جس سے غالبؔ نے دل لگایا تھا۔)

بیگ گراونڈ سے غزل :

پھر مجھے دیدہ تر یاد آیا
دل، جگر، تشنۂ فریاد آیا
دل لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر تیرا وقت سفر یاد آیا
آہ ! وہ جرأت فریاد کہاں
دل سے تنگ آکے جگر یاد آیا
پھر ترے کوچے کو جاتا ہے خیال
دلِ گم گشتہ مگر یاد آیا
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا
میں نے مجنوں کے لڑکپن میں اسدؔ
سنگ اُٹھایا تھا کہ گھر یاد آیا

(ڈومنی اور غالبؔ آمنے سامنے آجاتے ہیں)

غالبؔ : ہنس کے بلوائیے مٹ جائے گا سب دل کا گلہ
کیا تصور ہے تمہارا کہ مٹا بھی نہ سکوں

ڈومنی : تم نہ آؤ گے تو مرنے کی ہیں سو تدبیریں
موت کچھ تم تو نہیں ہو کہ بھلا بھی نہ سکوں

غالبؔ : اس قدر ضبط کہاں ہے کہ کبھی آ بھی نہ سکوں
ستم اتنا تو نہ کیجیے کہ اٹھا بھی نہ سکوں

ڈومنی : لگ گئی آگ اگر گھر کو تو اندیشہ کیا
شعلۂ دل تو نہیں ہے کہ بجھا بھی نہ سکوں

(ڈومنی اندھیرے میں گم ہو جاتی ہے اور غالبؔ اس کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ ڈومنی دوبارہ نظر آتی ہے)
بیک گراونڈ میں غزل :

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے؟
آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی ! یہ ماجرا کیا ہے
میں بھی منہ میں زباں رکھتا ہوں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے؟
ہم کو ان سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے؟
ہاں بھلا کر تیرا بھلا ہوگا
اور درویش کی صدا کیا ہے
جان تم پر نثار کرتا ہوں
میں نہیں جانتا دعا کیا ہے
میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

(سین ۔ 3)
مقام : غالبؔ کی حویلی

(اسٹیج خالی ہے۔ پھر ایک نوکر دیوانِ خانہ کی صفائی کرتا نظر آتا ہے)

بیک گراونڈ سے آواز :

میں غالبؔ کی حویلی ہوں۔ میں نے غالبؔ کی زندگی کے کئی رنگ دیکھے ہیں۔ دنیا کی ایسی کوئی خوشی نہیں جو غالبؔ کو نہیں ملی اور نہ کوئی ایسا غم ہے جو ان کے حصے میں نہیں آیا۔ غالبؔ نے کبھی اپنے غموں کا دکھڑا نہیں رویا بلکہ رب سے فریاد کی :

میری قسمت میں غم اگر اتنا تھا
دل بھی یارب کئی دیے ہوتے

(ایک دوسرا نوکر ایک بوری میں سامان لے کر آتا ہے۔ بوری اندر لے جا کر رکھ دیتا ہے اور پہلے نوکر سے کہتا ہے)

نوکر : اللہ اللہ! بازار میں آگ لگی ہے۔ قیمتیں آسمان کو چھو رہی ہیں۔ گیہوں ایک روپیہ میں پاؤ من۔ چنا ایک روپیہ میں پاؤ من۔ باجرہ کا آٹا ایک روپیہ میں آٹھ من۔ مونگ دال ایک روپیہ میں ایک من اور پیاز ایک روپیہ میں سات سیر، لہسن ایک روپیہ میں چھ سیر۔

دوسرا نوکر : غضب کی مہنگائی ہے۔ بیچارے مرزا نوشہ کیا کریں! لالہ دینے کو قرض دے دیتا ہے۔ کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا۔ میوہ فروش سے آم، صراف سے دام، قرض لیے جا رہے ہیں۔ یہ بھی تو سوچا ہوتا دیں گے کہاں سے۔

نوکر : مرزا اپنے ایک دوست سے کہہ رہے تھے کہ اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں، رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں، یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کیا ہے۔ کہتا ہوں کہ لو! غالبؔ کے ایک اور جوتی لگی بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں۔ آج دور دور تک میرا جواب نہیں اب تو قرض داروں کو جواب دے۔

دوسرا : مولانا احمد حسین نے دریافت کیا تھا کہ مرزا پور کب آ رہے ہیں تو انھیں لکھ دیا اب سوائے سفرِ آخرت اور کسی سفر کی نہ طاقت ہے نہ جرأت۔ جوان ہوتا تو احباب سے دعائے صحت کا طلب گار ہوتا۔ بوڑھا ہوں تو دعائے مغفرت کا خواہاں ہوں۔

دمِ واپسیں برسرِ راہ ہے عزیزو ! اب اللہ ہی اللہ ہے

پہلا نوکر : مرزاؔ صاحب کا یہ شعر تو دلّی کی گلیوں میں گونج رہا ہے :

ہوچکیں غالبؔ ! بلائیں سب تمام
اک مرگِ ناگہانی اور ہے

دوسرا : اب بادشاہ سلامت بھی کیا کریں؟ حامد علی خان کی ایک لاکھ تیس ہزار کی ڈگری بادشاہ پر ہوئی ہے۔

پہلا : اب نہ سخنوری رہی نہ سخن دانی۔ کس برتے پر تتّا پانی؟ ہائے دلّی ! وائے دلّی ! بھار میں جائے دلّی۔
(مرزا غالبؔ اندر سے باہر آتے ہیں۔)

غالبؔ : واہ میاں! دلّی کا پانی پی کر دلّی کو گالیاں دے رہے ہو؟ مانا کہ اب دلّی شہر نہیں کیمپ ہے۔ بتاؤ! کیا ماجرا ہے؟

نوکر : حضور! آج لالہ جی نے راستے میں روک لیا اور کہا کہ مرزا نوشہ سے کہہ دیں اس بار بھی ادائیگی میں تاخیر ہوئی تو وہ خود یہاں پہنچ جائیں گے۔

غالبؔ : زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے
(نوکر سلام کرکے باہر چلا جاتا ہے۔ بیگم صاحبہ دیوان خانے میں آتی ہیں)

بیگم : ہم بھی تو سنیں ملازموں کے سامنے کس کا دکھڑا رویا جارہا تھا؟

غالبؔ : آدمی کی کثرت غم سے سودائی جاتے ہیں۔عقل جاتی رہتی ہے۔ اس پر ہجومِ غم ...... غمِ مرگ ...... غمِ رزق ...... غمِ عزت۔

بیگم : آپ بادشاہ سلامت کی خدمت میں درخواست پیش کرنے والے تھے؟

غالبؔ : ابھی آپ نوکروں کے سامنے دکھڑا رونے کی بات کر رہے تھے، میں بھی بادشاہ سلامت کا نوکر ہوں، اپنا دکھڑا ان کے سامنے نہ روؤں تو کس کے سامنے روؤں؟
(ایک کاغذ نکالتے ہیں)
ملاحظہ فرمایئے :
(بیک گراؤنڈ سے آواز)
اے شہنشاہِ آسماں اورنگ
اے جہاں دار آفتاب آثار
تھا میں اک بے نوائے گوشہ نشیں
تھا میں ایک درد مند سینہ فگار

الفاظ و معانی

ہرکارہ قاصد، ڈاکیا **موصوف** تعریف کیا ہوا، ممدوح وہ جس کی تعریف کی جائے **مطلع** طلوع ہونے کی جگہ، غزل یا قصیدے کے شروع کا شعر **سخن ور** شاعر، عالم **دوام** ہمیشگی **مداومت** چشمک، آنکھ کا اشارہ **مخالفت** رنجش **نوج** خدا نہ کرے **ہُنڈی** روپیہ پرکھنے والا، مہاجن، ساہوکار **بزاز** کپڑا بیچنے والا **پارچہ فروش** سودائی دیوانہ، جنونی

مشق

(سین-1)

1. مندرجہ سوالوں کے جواب مختصر میں لکھیے :

(1) کون سا تخلص غالبؔ کی پریشانی کا باعث بنا؟

(2) مطلع سے متعلق غالبؔ نے کیا فرمایا؟

(3) کس شعر سے بادشاہ سلامت کو غلط فہمی ہوئی؟ وہ غلط فہمی کیا تھی؟

(4) بادشاہ سلامت نے اپنے استاد سے کون سی فرمائش کی؟

(5) کس وعدے پر غالبؔ کے دوستوں نے محفل سے اٹھنے کی اجازت چاہی؟

(سین-2)

2. مندرجہ ذیل سوالوں کے جواب مختصر میں لکھیے :

(1) غالبؔ کے نام کس کی چھٹی آئی تھی؟

(2) غالبؔ کے ہنسنے کی کیا وجہ تھی؟

(3) ڈومنی کون تھی؟

(4) غالبؔ اور ڈومنی کے مکالمے کو اپنی زبان میں بیان کیجیے۔

(سین-3)

3. مندرجہ ذیل سوالوں کے جواب مختصر میں لکھیے :

(1) نوکر نے غالبؔ کو اپنے دوست سے کیا کہتے سنا؟

(2) مولانا احمد حسین کے مرزا پور بلانے پر غالبؔ نے جواب میں کیا لکھ بھیجا؟

(3) لالہ جی نے نوکر سے کیا کہا؟

(4) غالبؔ نے اپنا دکھڑا سنانے کے بجائے جس شعر میں رب سے فریاد کی ہے اسے لکھیے۔

4. (الف) (1) فجائیہ۔ یہ علامت ان الفاظ اور جملوں کے بعد لگائی جاتی ہے۔
جس سے کوئی جذبہ ظاہر ہوتا ہے۔

(2) سوالیہ۔ یہ علامت سوالیہ جملے کے آخر میں لگائی جاتی ہے۔

اس سبق میں ان دونوں علامتوں کا استعمال ہوا ہے۔ ایسے جملے اس سبق سے تلاش کر کے لکھیے۔

●

28 موسموں کا گیت

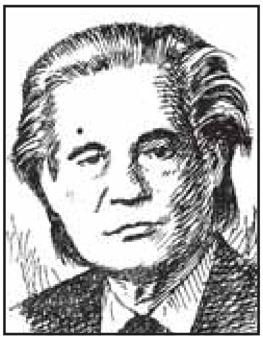

علی سردار جعفری

پیدائش : 1913ء وفات : 2003 وطن : بلرام پور

علی سردار جعفری کا خاندان مذہب کا بڑا پابند اور پرہیزگار تھا۔ ابتدائی تعلیم سلطان المدارس لکھنؤ سے حاصل کی۔ دلی یونیورسٹی سے بی۔ اے اور لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم۔ اے کے امتحانات پاس کیے۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی جد وجہد آزادی میں شریک رہے اور اسی سلسلے میں انہیں دوبار جیل جانا پڑا۔ بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں۔ لیکن غزل میں بھی انھوں نے الگ انداز اپنایا ہے شاعر ہونے کے علاوہ ایک اچھے مقرر اور نثر نگار بھی ہیں۔ ''نیا ادب'' اور ''گفتگو'' جیسے مؤقر ادبی رسائل کی ادارت بھی کی۔ سردار ترقی پسند ادب کے اہم ستون مانے جاتے ہیں۔ 1976ء میں انہیں حکومت نے ''پدم شری'' کے خطاب سے نوازہ 'پرواز' 'پتھر کی لکیر' 'ایک خواب اور' پیرہن شرر ان کے شعری مجموعے ہیں۔ ترقی پسند تحریک اور لکھنؤ کی پانچ راتیں ان کی نثری کتابیں ہیں۔ 'ایک خواب اور' پر انھیں سوویت دیس کا 'نہرو اوارڈ' بھی عنایت کیا گیا۔ ان کی مجموعی خدمات کے اعتراف میں انھیں ملک کا اہم ترین اور باوقار اعزاز ''گیان پیٹھ'' سے بھی سرفراز کیا گیا۔

مندرجہ نظم کالی داس کی نظم ریت سیون ہار سے ماخوذ ہے۔ ہمارے یہاں بارہ ماسہ سے لے کر کلاسیکی شاعری میں موسموں کی شاعری کی جو روایت موجود ہے اس کا گہرا اثر سردار جعفری کی نظم پر نظر آتا ہے یہ نظم اپنی گوناگوں شعری کیفیات کے سبب اردو نظمیہ شاعری میں اپنا ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔

لو وہ آتی ہے خزاں، گاؤں کی کنواری جیسے
ناز و انداز کی جاں، حسن کی نازک مورت
بالیاں دھان کی بالوں میں سجا رکھی ہیں
دونوں رخسار دمکتے ہیں کنول کی صورت
جسم پر گھاس کے پھولوں کا مہکتا ملبوس
اپنی رفتار سے ہنسوں کو بھی شرماتی ہوئی
اس کے سواگت میں چہک اٹھتی ہیں چڑیاں جیسے
کسی معشوق کی پایل کی صدا آتی ہوئی ہے
رات کی مانگ میں تاروں کی سنہری افشاں
تاجِ مہتاب سے کچھ اور بھی روشن ہے جبیں
پیرہن، چاند کی کرنوں کا چمکتا ریشم

اتنا شفاف کہ بادل کا کہیں نام نہیں
ہنستی ہے دیکھ کے منہ چاند کے آئینے میں
پڑتی ہے سانولے مکھڑے پہ تبسم کی پھوار
ایسا لگتا ہے کہ نو عمر ہے، دو شیزہ ہے
ابھی آنے کو ہے بھرپور جوانی کی بہار

دھان کے کھیت، وہ استادہ ثمر بار درخت
جھوم اٹھتے ہیں جب آتے ہیں ہوا کے جھونکے
لے کے آغوش میں جب ناچتی ہے بادِ خزاں
پھول ہی پھول برس جاتے ہیں پیڑوں کے تلے
جھر جھری لیتی ہیں آہستہ کنول کی جھیلیں
کلیاں منہ چوم کے کلیوں کا جھجھک جاتی ہیں
عشق کے ماروں کو آتا ہے محبت کا خیال
خواہشیں دل کے کٹوروں سے چھلک جاتی ہیں

اس خزاں میں بھی مگر تو ہے بہاروں کی بہار
نوجوان جسم سے گل رنگ شگوفے پھوٹیں
پیار کے ہاتھ محبت سے سنواریں تجھ کو
کبھی ہونٹوں، کبھی مشتاق نگاہوں سے چھوئیں
مسکرائے ترے پیروں کی حنا، اور مہکے
زعفراں جسم کی، سینے کا سنہرا صندل
دل پہ عشاق کے زلفوں کی گھٹائیں برسیں
ڈھونڈھیں خود بھونروں کو ہنستی ہوئی آنکھوں کے کنول